# خواہش

اور

## دوسرے افسانے

ابو تنویر خضر دہلوی

فیروز سنز

پرنٹرز، پبلشرز، بک سیلرز اینڈ اسٹیشنرز

کراچی — میکلوڈ روڈ
لاہور — ۶۰۔دی مال
پشاور — ۳۵۔دی مال

# اُن کی نذر

جن کے سینے میں دل ہے

اور

دل میں محبت!

خضر

بار اول ——————— ۱۹۵۱ء

تعداد اشاعت ——————— دو ہزار

قیمت ——————— دو روپیہ آٹھ آنے

پرنٹر پبلشر ——————— عبد الغنی برقؔ

مطبع

فیروز سنز ——— میکلوڈ روڈ کراچی

# فہرست

# عرضِ ناشر

"کیف و مستی" کے بعد "خواہش" خضر دہلوی کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے "کیف و مستی" کے افسانے خضر دہلوی کی اپنی دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہیں لیکن "خواہش" کے بیشتر افسانے دوسری زبانوں سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔

ایک زبان کو دوسری زبان میں منتقل کرنا اتنا آسان نہیں جتنا کہ عوام نے سمجھ رکھا ہے۔ اگر ایسا ہو تو دنیا کا ہر پڑھا لکھا انسان افسانہ نگاری کے میدان میں شہسواری کا دعویٰ کرنے لگے۔ قدرت نے رواں اور سلیس ترجمہ کرنے کا فن کسی کسی کو ہی ودیعت کیا ہے۔ خضر انہی مخصوص ہستیوں میں سے ایک ہے جس کے یہ زیرِ نظر تراجم اتنے کامیاب نظر آتے ہیں کہ شروع تا آخر کہیں بھی ترجمہ محسوس نہیں ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام تر افسانے خضر کے اپنے افکار اور زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔

خضر دہلوی چونکہ نوجوان ہیں اس لئے ان کا انتخاب بھی جوان ہے۔ افسانوں کے زیرِ نظر مجموعہ میں ایک بھی افسانہ ایسا نہیں جسے شروع کر کے چھوڑنے کو جی چاہے۔ جوانی جو کچھ بھی چاہتی ہے اور جس قسم کے واقعات و حادثات کی متلاشی ہے، وہی سب کچھ ان افسانوں

میں بدرجہ اُتم موجود ہے لیکن اس کے باوجود ان افسانوں میں عریانیت کا شائبہ تک نہیں آپ انہیں چھپ چھپ کر پڑھنے کی بجائے کھُلے بندوں پڑھ سکتے ہیں اور ان سے اسی طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں جس طرح عریاں افسانوں سے !

**ناشر**

# انوکھا رومان

اُس نے میز پر پڑا ہوا کل کا اخبار اُٹھا کر سُرخیوں کو سرسری نظر سے دیکھا۔ پڑھی ہوئی خبروں میں مزید دلچسپی کہاں سے آتی؟ اُکتا کر اُس نے اخبار پھینک دینا چاہا۔ لیکن اُس کی نگاہیں اچانک ضرورت کے کالم پر پڑیں۔ اُس نے ایک ہی نظر میں تمام کالم ختم کر دیا۔ دوسرے کالم میں رشتوں کی ضرورت کے اشتہار تھے۔ وہ غور سے پڑھنے لگا۔

ہریش کی شادی کی بات کتنی جگہ سے آچکی تھی۔ لیکن اُس کے والدین کی نگر انتخاب کسی پر جمی نہ تھی۔ اُن کی نگاہیں کسی اونچے گھرانے کی متلاشی تھیں۔ ہریش ولایت سے وکالت پاس کر کے آیا تھا۔ اُس کے والدین کو اس کے "انگلینڈ رٹرن" ہونے پر فخر تھا۔ پھر وہ کسی ایسے ویسے گھرانے میں اپنے ہریش کا بیاہ کیونکر کر سکتے تھے؟ ہریش نے سوچا کیوں نہ وہ بھی اسی طرح کسی اخبار میں اشتہار دے دے اور اشتہار میں لڑکی کیلئے رشتہ ور کے ضرورتمندوں سے لڑکی کی تصویر بھی طلب کی جائے۔ اس طرح نہ صرف بہت سی لڑکیوں سے اُس کی واقفیت ہی ہوجائے گی بلکہ کتنی ہی

لڑکیوں کی خوبصورتی و رعنائی اور اُن کی خوبیوں کو پرکھنے کا موقع بھی مل جائے گا اور اس طریقے سے اگر کوئی لڑکی اُسے پسند آ گئی تو وہ خود کر کے اُس سے شادی کرنے کی سر توڑ کوشش کرے گا۔

کتنا حسین خیال تھا یہ اور کتنی شوق انگیز تھی یہ خواہش! ہریش کچھ دیر کیلئے پُر نشاط تصورات میں کھو گیا۔ جوان آرزوئیں اُس کے دل میں انگڑائیاں لینے لگیں۔ آنکھوں کے سامنے حسن و شباب کے لٹتے ہی دلکش و دلفریب پیکر ناچ اُٹھے پرماتما نے کیسی اچھی اچھی صورتیں بنائی ہیں۔ جی چاہتا ہے اِن سب کو اپنی آغوش میں چھپٹ لوں اور ــــــ ٹن ٹن گھڑی نے تین بجائے۔ وہ چونک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ایسا محسوس کیا جیسے جنت کی حسین وادیوں سے کسی نے اُسے جہنم کی طرف دھکیل دیا ہو۔ وہ ایک لمبی سانس لے کر پھر کرسی پر گر پڑا اور چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک کونے میں مکڑی نے جالا بُن رکھا تھا اور شکار کی تاک میں بیٹھی تھی اور دوسری طرف ایک چھپکلی چپکے چپکے چھوٹے چھوٹے کیڑوں کو لپک لپک کر ہڑپ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ چھپکلی کا یہ شکار دیر تک دیکھتا رہا۔ یکایک اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ دنیا میں سبھی غرض کے بندے ہیں۔ ابھی ابھی کچھ دیر پہلے پڑھے ہوئے ضرورت کے اشتہارات میں اُسے غرض کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا۔ اِس کے ساتھ ہی کچھ روز پہلے پڑھے ہوئے "بیسویں صدی" کے 'تیر و نشتر' کا خیال آ گیا۔ جس میں اشتہار بازی پر نہایت دلچسپ انداز میں طنز کیا گیا تھا۔ شادی کے اشتہارات پر جو ایک پھبتی کسی گئی تھی۔ اُس کی یاد تازہ ہوتے ہی وہ ہنس پڑا ــــــ لوگ کہتے ہیں کہ اشتہار دینے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ یہ محض اُن کا خیالِ خام ہے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ بیان کیا گیا تھا کہ انگلینڈ کی ایک سن رسیدہ عورت نے اشتہار دیا کہ وہ شادی کرنا چاہتی ہے اور اُس نے اپنی عمر بہت کم لکھی۔ لڑائی کے محاذ سے ایک نوجوان نے اشتہا

پڑھ کر شادی کا پیغام بھیج دیا۔ عورت نے آسے قبول کرنے میں ذرا بھی تاخیر سے کام نہ لیا اور "بہ اکسی" اصول پر اُن کی شادی ہو گئی۔ کچھ دنوں بعد وہ نوجوان لڑائی میں مارا گیا اور اُس کی بیوی کو پانچ ہزار کے بیمے کی رقم اور عمر بھر کے لئے پنشن مل گئی۔ آخر میں لکھا تھا۔ اس پر بھی لوگ اشتہار دینے کو بے سود سمجھتے ہیں۔ اس واقعہ کی روشنی میں جب ہریش نے ان اشتہارات کو نقادانہ نگاہوں سے دیکھا تو اس سے یہ بات چھپی نہ رہ سکی کہ جن لڑکوں کے لئے لڑکیاں چاہیئے تھیں، وہ سب کے سب بڑے آدمیوں کے لڑکے تھے اور بڑی بڑی تنخواہیں پاتے تھے۔ جہیز کی بھی کسی کو ضرورت نہ تھی اور ذات پات کا بھی اُنہیں کوئی خاص خیال نہ تھا۔ اسی طرح لڑکیوں کی خوبصورتی و جوانی کے مظاہرہ کے ساتھ ساتھ اُن کی خوبیوں کی طرف توجہ دلائی گئی تھی، اپنے دولت مند ہونے کا ذکر بھی خاص طور پر کیا گیا تھا جس سے صاف ظاہر تھا کہ جہیز میں ایک بہت بڑی رقم ملنے کی امید ہے۔ ہریش نے سوچا۔ انہیں آخر اس طرح ترغیب دینے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کیا ان لڑکے اور لڑکیوں کو کوئی رشتہ نہیں ملتا؟ بہت دیر تک ذہنی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس سلسلہ میں اشتہار بازی فضول ہے اور اس کے بعد فوراً ہی اُس نے اپنے ذہن کو کسی اور طرف متوجہ کر لیا۔ سوچتے سوچتے اچانک اُس کی نگاہیں تہہ کئے ہوئے اخبار پر پڑیں۔ اُس نے پھر اخبار اٹھا لیا۔ ضرورت کے کالم کو سرسری نظر سے دیکھا سب سے آخری اشتہار پر اُس کی نگاہیں جم کر رہ گئیں۔ ایسا اشتہار کبھی بھی اُس کی نظر سے نہ گذرا تھا۔ اشتہار کا عنوان تھا "دوستی کیجئے" اور نیچے لکھا تھا "دوستی کیجئے اور اپنے حلقۂ احباب کو وسیع کیجئے۔ دور دور کے لوگوں سے متعارف ہونے کے لئے ہمیں خط لکھیں۔"

اشتہار سکریٹری صاحب پین فرینڈس کلب لکھنؤ کی طرف سے شائع کیا گیا

تھا۔ ہریش نے کئی بار اشتہار کو پڑھا ـــــــ پڑھا اور کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔
انسان وقت گذاری نیز تفریح کے لئے بعض اوقات ایسی ایسی حرکتیں کرتا ہے جو اپنی دلچسپی کے باعث بے شمار قہقہوں کا موجب ہوتی ہیں۔ ہریش کے دل میں بھی ایک خیال نے گدگدی پیدا کی اور اُس نے پین فرینڈس کلب کے سکریٹری کے نام ایک خط لکھا۔

سکریٹری صاحب نمستے۔

میں ایک اٹھارہ سالہ خوبصورت وجوان لڑکی ہوں۔ اس سال میں نے ایف۔ اے کیا ہے اور اب بی۔ اے کی تیاری کر رہی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ کسی اپنی ہم عمر لڑکی کو خط کتابت کیلئے سہیلی بناؤں۔ ازراہِ کرم کسی سے میرا تعارف کرا دیجئے۔ میں آپ کی بے حد ممنون ہوں گی۔

آپ کی
سوشیلا دیوی
معرفت ہریش چندر ورما
بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی
مراد آباد (یو۔ پی)

خط لفافہ میں بند کر کے ہریش نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ چار بجنے میں ابھی دس منٹ باقی تھے۔ "میٹنی شو" سوا چار بجے شروع ہوتا تھا۔ اُس نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کئے اور باہر نکل آیا۔ راستہ میں اُس نے لفافہ لیٹر بکس میں ڈال دیا۔
تیسرے ہی دن جواب آگیا۔ لکھا تھا کہ باقاعدہ ممبر بننے اور فیس ممبری پیش کرنے کے بعد آپ کے حسب منشا تعارف کرا دیا جائے گا۔ اس خط کے ساتھ ہی کلب

کے چھپے ہوئے اغراض و مقاصد اور ممبری کے مطبوعہ فارم بھی تھے۔

ایک جوان لڑکی سے خط و کتابت کرنے اور متعارف ہونے کے شوق میں اُس نے فیس ممبری کا منی آرڈر اور فارم پُر کر کے بھجوا دیا۔

بواپسی ڈاک اُسے سکریٹری کا خط ملا۔ سکریٹری صاحب نے لکھا تھا کہ مس منورما بی۔ اے میں پڑھ رہی ہیں اور گوجرانوالہ کے ایک ممتاز خاندان کی نورِ نظر ہیں۔ آپ کے بارے میں انھیں لکھ دیا گیا ہے۔ آپ اِن سے خط و کتابت کر سکتی ہیں۔ پتہ ذیل میں درج ہے۔

مس منورما معرفت ڈاکٹر چندر پرکاش

ایم۔ بی۔ بی۔ ایس۔ امرتسر

"منورما!" جیسا نام پیارا ہے، صورت بھی یقیناً ویسی ہی پیاری ہوگی۔ جوان لڑکی! اس خیال کے ساتھ ہی خوبصورت اور جوان لڑکیاں اُس کی آنکھوں میں انگڑائیاں لینے لگیں۔ فریم میں لگی ہوئی "منورما" کی تصویر میز پر رکھی تھی۔ اُس کی نگاہیں اس تصویر پر جم گئیں۔ ایسی ہی جوان اور اتنی ہی خوبصورت ہوگی...... نہیں نہیں، وہ اس سے بھی کہیں زیادہ حسین ہوگی۔ ایکٹرس کی خوبصورتی محض کیمرے اور میک اپ تک محدود ہے۔ یہ محض نام کی منورما ہے۔ وہ منورما کلوپیٹرا اور ہیلن کی طرح عشوہ طراز اور نورجہاں کی طرح حسن و رعنائی میں اپنی مثال آپ ہوگی!

اور اُس نے اسی وقت میز کی دراز سے لیٹر پیڈ نکال کر خط لکھنے کیلئے قلم اٹھایا لیکن کیا لکھے؟ کیا یہ لکھے کہ میں ہریش ہوں...... لطف تو اسی میں ہے کہ ایک کنواری لڑکی بن کر گھونگھٹ کی اوٹ سے خط و کتابت کی جائے۔

وہ لکھنے لگا ———

ڈیر مس منورما!

دور دیس میں بسنے والی میں آپ کی ایک بہن ہوں۔ لکھنؤ
کی پین فرینڈس کلب کے سکریٹری صاحب کی وساطت سے
آپ کا غائبانہ تعارف حاصل کر کے مجھے بے حد مسرت ہوئی۔
انہی کے ارشاد کے بموجب آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ امید ہے
کہ آپ بوالپسی ڈاک جواب دیں گی۔ میری یہ خوش نصیبی ہے کہ
آپ سے پنجاب کی بہت سی باتیں جاننے کے ساتھ ساتھ مجھے
آپ کی سہیلی بننے کا فخر حاصل ہوگا۔ آپ بھی مجھ سے جو پوچھنا
چاہیں شوق سے پوچھیں۔ باقی آپ کا خط ملنے پر۔

آپ کی

سوشیلا دیوی

کچھ دنوں بعد جواب آیا۔ خوش رنگ و حسین لفافہ ہاتھ میں لیتے ہی اُس کے دل میں گدگدی ہونے لگی۔ بھینی بھینی خوشبو میں بسے ہوئے نہایت ہی جاذب نظر لیٹر پیپر پر لکھا تھا ــــ

ڈیئر مس سوشیلا دیوی!

آپ کا خط ملا۔ کلب کے سکریٹری صاحب نے مجھے بھی
آپ کے بارے میں لکھا تھا۔ آپ سے متعارف ہو کر مجھے
بہت خوشی حاصل ہوئی۔ میں آپ کو خط لکھنے ہی والی تھی،
لیکن سکریٹری صاحب نے لکھا تھا کہ پہلے آپ کا خط مجھے
ملے گا۔ اس لیے میں آپ کے خط کا انتظار کرتی رہی۔ میری
بھی یہ خوش نصیبی ہے کہ آپ کی سہیلی بننے کا موقع ملا۔ یہاں
تو ان دنوں غضب کی گرمی ہے۔ کہیئے آپ کے یہاں کا موسم

کیسا ہے؟ خط کا جواب جلد دیجئے۔

آپ کی

منورما

خط پڑھنے کے بعد ہریش نے اپنے دل میں ایک گدگدی سی محسوس کی اور اُس کے ساتھ ہی اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی جوان عورت اُس کے سامنے انگڑائی لے رہی ہے۔ بھینی بھینی خوشبو میں بسا ہوا لیٹر پیپر اور موتیوں کی طرح گندھا ہوا ہینڈ رائٹنگ دیکھ کر وہ کیف و نشاط کی دنیا میں کھو گیا۔

آہستہ آہستہ وہ ایک دوسرے سے بہت گھل مل گئے۔ کئی کئی صفحات کے خطوط دونوں طرف سے آنے جانے لگے۔ یوں تو ہریش کے ذہن میں جو باتیں آتیں لکھتا لیکن اُس کے ذہن میں یہ بات ایک سُرخ نشان کی طرح اجاگر رہتی کہ ایک جوان عورت کو اپنے دل کا حال سنانے اور اُس سے بھی اُس کے دل کا حال جاننے کی غرض سے وہ یہ سب کچھ کر رہا ہے۔

آپس میں بہت زیادہ گھل مل جانے کے باعث ڈیئر مس سوشیلا اور ڈیئر مس منورما کی بجائے پیاری مس سوشیلا اور پیاری مس منورما نے جگہ لے لی اور جب ہریش "پیاری منورما" لکھتا تو اُس کا دل دھڑکنے لگتا۔ سارے جسم میں ایک سنسنی پھیل جاتی اور وہ ایک سردِ سانس چھوڑ کر دل ہی دل میں دہراتا "پیاری منورما" اور دیر تک نہ جانے کیا کیا سوچتا رہتا۔

ایک خط میں ہریش نے لکھا۔ سناؤ برسات کے اس جذبات انگیز موسم میں تمہارا دل کن خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ کوئل کی کوکو، پپیہے کی پی ہو، پی ہو اور اُمڈ اُمڈ کر آنے والی گھنگھور گھٹاؤں کو دیکھ کر دل میں کیسے جذبات انگڑائیاں لیتے ہیں؟......

منور ما کا جواب آیا۔ سوشیلا پیاری، تم نے تو میرے دل کی بات چھا لی ہے بالکل یہی میں تم سے پوچھنے والی تھی۔ دل کی حالت کیسی ہے، کیا بتاؤں؟ تم اپنے ہی دل سے پوچھ لو، ہر وقت ایک میٹھی میٹھی سی کسک اٹھتی رہتی ہے۔ ہم کھلنے والی کلیاں ہیں، جو کسی رس کے لوبھی بھونرے کی راہ دیکھ رہی ہیں۔ لیکن کیا بتاؤں؟ ہندوستانی لڑکی کی زندگی ایک بار ہے۔ بچپن گھر کے ہر فرد کی جھڑکیاں سہہ سہہ کر گزرتا ہے اور جب ہم نے ذرا ہوش سنبھالا تو ہمیں قید میں ڈال کر ہر طرح کی آزادی سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اُمڈ اُمڈ کر جذبات دل میں طوفان برپا کرتے ہیں لیکن ہمیں اپنی امنگوں کا گلا گھونٹ دینا پڑتا ہے۔

ہرنش سوچتا کاش اس کی رفیق زندگی بھی ایسی ہی ہو، جیسی منور ما ہے۔ جتنے اچھے خیالات ہیں اس کے، ویسی ہی صورت بھی حسین ہو تو اُس سے شادی ہو جانے پر اُس کی زندگی ہر طرح سے مطمئن و مسرور ہو سکتی ہے۔ جس دن اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا۔ اُسی دن اُسے منور ما کو خط بھی لکھنا تھا۔ اُس نے لکھا: "تم نے آئندہ زندگی کے متعلق کیا سوچا ہے؟ کیسے رفیق زندگی کو پسند کرتی ہو تم؟ ہونے والے پتی سے ملنے کا شوق تمہارے دل کو گدگداتا ہے؟ اوہ، تمہارا دل دھڑکنے لگا؟ تم بتاؤ یا نہ بتاؤ، میں تو صاف سن رہی ہوں۔ اور ہو سکتا ہے، یہ میرے ہی دل کی آواز ہو!

منور ما نے جواب میں لکھا۔ سوشیلا پیاری! ہم ہندوستانی لڑکیاں تو کٹھ پتلیاں ہیں۔ ہمیں ماں باپ کے اشاروں پر ناچنا پڑتا ہے۔ اگر میرے دل کی پوچھو تو میں چاہتی ہوں ایک گریجویٹ حسین نوجوان، دولتمند اور باعزت، روزگار سے وابستہ۔ ملازمت سے مجھے چڑ ہے اور ملازم پیشہ لوگوں سے مجھے نفرت ہے........ اچھا تم بتاؤ، تم کیا سوچتی ہو، سماج کی طرف سے ہم پر جو ظلم کیے جاتے ہیں، اُن کے

متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ ..........

ہریش نے لکھا ـــــ اگر میرا بس چلے تو میں اِس سماج کی بنیادیں ہلادوں۔ یہ ہم ابلاؤں پر ظلم کرنا جانتا ہے لیکن ہمارے دل میں جھانک کر ہماری سسکتی ہوئی آرزوؤں اور تمناؤں کو دیکھنا اور دیکھ کر ذرا بھی رحم کرنا نہیں جانتا۔ کتنا ظالم ہے یہ سماج! بغیر دیکھے، بغیر ملے اور بغیر سمجھے، کیا کسی ایسے شخص سے تم شادی کرنا پسند کروگی؟ ہاتھ پیر بندھوا کر چپ چاپ کنوئیں میں کود پڑوگی؟

منورما نے لکھا...... ہمارے گھرانے کو آزادی کی کچھ ہوا لگ چکی ہے۔ کچھ لحاظ باقی رہ گیا ہے، وہ بھی کچھ دنوں تک جاتا رہے گا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ بغیر دیکھے، بغیر ملے اور بغیر سمجھے ہرگز ہرگز کسی سے شادی نہ کروں گی۔ والدین چاہے لاکھ سر ماریں۔ ڈوب مروں گی، زہر کھالوں گی مگر اپنی زندگی کا سودا بغیر دیکھے بھالے ہرگز ہرگز نہ ہونے دوں گی! ........

ہریش نے لکھا...... کیا کوئی دل کے آئینے میں اُتر آیا ہے؟ کون خوش نصیب ہے وہ؟ ذرا ہمیں بھی تو بتاؤ؟ ........

منورما نے لکھا...... تم نے غلط سمجھا ہے، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے تو صرف اپنا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ تمہارا دل تو کسی نے نہیں چھین لیا؟

منورما کا خط پڑھتے ہی ہریش کے دل پر سے ایک بوجھ سا اُتر گیا۔ اُس نے بھی اُسے جواب میں لکھا کہ وہ بھی اپنے پتی کا انتخاب خود ہی کرے گی اور والدین کے انتخاب کو ہرگز ہرگز قبول نہ کرے گی۔

کچھ دن اور گذر گئے، ہریش کے دل میں منورما سے ملنے کا شوق انگڑائیاں لینے لگا۔ منورما اور اس کے خیالات میں کتنی یگانگت ہے؟ اگر کسی طرح ملاقات ہو جائے تو وہ یقیناً اُسے پسند کرے گی۔ اس نے لکھا...... تم سے ملنے

کو جی چاہتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم مل سکیں؟......

اُدھر سے جواب آیا...... بہت دنوں سے میرے دل میں بھی یہی اشتیاق کروٹیں لے رہا ہے۔ کچھ دنوں تک ہمارے چند قریبی رشتے دار سر دوار آنے والے ہیں۔ اگر ہو سکا تو میں بھی اُن کے ساتھ آؤں گی اور تم سے ملنے کی ضرور کوشش کروں گی؟......

ہریش نے فوراً ہی لکھا۔ "تم ضرور آنا، مجھے تمہارا انتظار رہے گا۔" اور اُس وقت کا خیال کر کے جبکہ ان کی ملاقات ہوگی اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ کیا سمجھے گی وہ؟ اس طرح ایک لڑکی کو فریب دینا سوسائٹی اور سماج تو ایک طرف قانون کے بھی خلاف ہے۔ لیکن...... لیکن وہ یقیناً اسے اس حُسن فریب کے لئے معاف کر دے گی۔ یہ فریب سہی، لیکن منورما کے خواب آرزو کی تعبیر بھی تو ہے۔ اور اس کے بعد یقیناً وہی ہوگا جس کی اُسے توقع ہے۔

ایک دن اُسے ایک تار ملا......... ۱۸ر اکتوبر کو پہنچ رہی ہوں ——
—— منورما۔

وفورِ مسرت سے ہریش کا دل ناچ اٹھا۔ ۱۸ر تاریخ کو خوب بن ٹھن کر، دل میں آرزوؤں اور تمناؤں کی دنیا لئے ہوتے اسٹیشن پر پہنچا۔ گاڑی آدھ گھنٹہ لیٹ تھی۔ نہایت اضطراب و بیقراری سے آدھ گھنٹہ گذرا۔ گاڑی آئی، جسم کا تمام خون کھنچ کر جیسے سر میں آگیا ہو۔ اُسے اسٹیشن گاڑی اور آدمی گھومتے ہوئے معلوم ہوئے کسی طرح وہ اپنے آپ کو سنبھال کر آگے بڑھا اور گاڑی سے اُترنے والوں میں منورما کو تلاش کرنے لگا۔ اُس کا خیال تھا کہ وہ پنجابی لباس میں ہوگی، لیکن اُسے مسافروں میں ایسی کوئی لڑکی نظر نہ آئی جسے وہ منورما سمجھے۔

وہ تیزی سے پلیٹ فارم کے اِس سرے سے اُس سرے پر پہنچ گیا۔

لیکن مایوس ہی لوٹنا پڑا۔ واپسی میں سیکنڈ کلاس کے ایک ڈبے کے باہر اُس نے نیم مغربی لباس میں ملبوس ایک حسین لڑکی کو دیکھا ــــ دیکھا اور یہ سوچکر کہ یقیناً یہی منورما ہے، وہ جلدی سے اُس کے پاس پہنچا اور اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے پوچھنا چاہا کہ آپ ہی مس منورما ہیں؟ مگر جرأت نہ ہوئی۔

اُس لڑکی نے ہریش کو اپنی طرف گھورتے ہوئے دیکھ کر متنفر نگاہوں سے گھورتے ہوئے دیکھا اور بڑبڑاتے ہوئے مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"کیا یہی سامان ہے آپ کا؟" ہریش نے ذرا جرأت سے کام لیا۔

"سامان؟" لڑکی نے گھوم کر ہریش کی طرف دیکھا "کیا مطلب؟"

"مطلب؟" ہریش زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا "مطلب یہ کہ آپ کا سامان پورا ہے نہ؟"

"لیکن میرا سامان پورا بھی ہو تو آپ کو کیا؟"

"اوہ، آپ پہچانتی نہیں، میں سوشیلا کا بھائی ہریش ہوں۔ وہ خود تو نہیں آسکی، مجھے بھیج دیا کہ میں آپ کو لے آؤں۔ آپ مس منورما ہیں نہ؟" ہریش نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ کر قلی کو آواز دی۔

"میں مس منورما نہیں ہوں، مس منورما کی تلاش میں کسی فلم کمپنی میں جائیے۔ مس منورما آپ کو اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر نہیں مل سکتی۔"

یہ کہہ کر لڑکی جلدی سے آگے بڑھ گئی۔ قلی سامان اٹھائے ہنستا ہوا اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑا اور ہریش اپنا سا منہ لے کر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

ٹرین سے اُترنے والے سب جا چکے تھے۔ ایکبار پھر ہریش نے پلیٹ فارم پر نظر دوڑائی اور مایوس ہو کر اسٹیشن کے باہر نکل آیا۔

ابھی وہ اپنے دفتر کے برآمدے میں ہی تھا کہ چپراسی نے اُسے بتایا

کہ ایک بابو جی اُس سے ملنے کے لئے کہیں باہر سے آئے ہیں اور اندر کے کمرے میں بیٹھے ہیں۔ ہرلیش نے اندر جاکر دیکھا، ایک سوٹڈ بوٹڈ نوجوان نہایت اطمینان سے آرام کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔

ہرلیش کے پاؤں کی آہٹ سن کر نوجوان نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ کھڑے ہو کر نمستے کی، ہاتھ ملایا اور بولا "میں امرتسر سے حاضر ہوا ہوں۔"

"اوہ، آپ امرتسر سے آ رہے ہیں، مس منورما کہاں ہیں؟" ہرلیش نے کمرے میں پڑے ہوئے ایک دوسرے کوچ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ نہیں آسکیں۔" نوجوان نے جواب دیا۔

ہرلیش نے نہ آنے کی وجہ دریافت کرنا چاہی، مگر پوچھتے پوچھتے رک گیا۔ کچھ دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ آخر نوجوان بولا۔ "یکایک اُس کا ارادہ بدل گیا، لیکن میں کلکتے جا رہا تھا، اُس نے ضد کر کے یہاں اُترنے کے لئے مجھے آمادہ کر لیا۔ یہ کچھ سوغات بھیجی ہے اُس نے، کہیے مس سوشیلا تو راضی خوشی ہیں نہ؟"

"ہاں ہاں......" ہرلیش نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا۔ "لیکن...... وہ لوگ تو آج ہی دہلی چلے گئے ہیں۔"

"دہلی؟"

"جی ہاں"

"کب تک واپس ہوں گی؟"

"یہی دو چار دن تک"

"یہ بھی خوب رہی۔" نوجوان نے ہنستے ہوئے کہا۔

کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر ہرلیش نے پوچھا "آپکا شبھ نام؟"

"مجھے پرکاش کہتے ہیں۔"

"خوب!...... ہاں، آپ کا سامان کہاں ہے؟"

"وہ تو اسٹیشن پر ہی کلاک روم میں پڑا ہے۔"

"ارے، یہ کیوں، یہاں کیوں نہیں لائے؟"

"مجھے آج ہی شام کی گاڑی سے کلکتے جانا ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا، آپ رسید دیجئے، میں سامان منگائے لیتا ہوں۔"

پرکاش "نہ نہ" ہی کرتا رہا۔ لیکن ہریش نے چپراسی کو رسید دے کر اسٹیشن پر بھیج ہی دیا۔ اس کے بعد کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر نوکر چائے لے آیا۔ دونوں نے چائے پی، اور پھر ہریش اُسے اپنے مکان پر لے آیا۔

رات کو کھانا کھاتے وقت اور اس کے بعد دونوں باہم بہت قریب ہو گئے۔ دونوں کی باتیں سن کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ برسوں سے ایک دوسرے کے دوست ہوں۔ بارہ بجنے لگے، تو دونوں سونے کے لئے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

ہریش کا بوڑھا نوکر، ہرکھو، رواج کے مطابق پرکاش کے پاؤں دبانے کے لئے آ پہنچا۔ اُس نے لاکھ کہا کہ اُسے پاؤں دبوانے کی عادت نہیں ہے۔ لیکن ہرکھو نہ مانا۔ پاؤں دبواتے دباتے پرکاش نے اُس سے بہت سی باتیں پوچھیں۔ پھر پوچھا "گھر کے لوگ دہلی کیوں گئے ہیں؟"

"بڑے بابوجی اور اماں جی ہریش بھیا کے رشتہ کے سلسلہ میں گئے ہیں۔"

"بس اماں جی اور بابوجی ہی گئے ہیں؟ اور کون گیا ہے ان کے ساتھ؟"

"نارائن ہے ساتھ میں۔"

"اور کوئی نہیں؟"

"جی نہیں، اور کوئی نہیں گیا۔"

" اور...... اور...... سوشیلا بی بی کہاں گئی ہیں؟"

"سوشیلا بی بی کون؟" حیرت سے ہرکھو نے پوچھا۔

"ارے ہریش بابو کی بہن یا کوئی رشتہ دار۔"

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں بابوجی؟ یہاں تو ہریش بھیا کے سوا اور کوئی اولاد ہی نہیں ہمارے بابوجی کے۔"

"تمہیں...... تمہیں ٹھیک معلوم ہے؟"

"بابوجی! اتنے سے تھے جب ہریش بھیا، تب سے انہیں گودی میں کھلا کھلا کر بڑا کیا ہے۔ میری کئی پشتوں نے اس گھر کا نمک کھایا ہے۔ مجھے نہیں معلوم، تو......"

ہرکھو اسے دیکھتا رہ گیا اور وہ جھٹ سے اٹھ کر کمرے سے باہر ہو گیا۔ ہریش کے کمرے میں پہنچ کر وہ ایک کاؤچ پر گر پڑا۔ ہنسی کے مارے وہ لوٹ پوٹ ہوا جا رہا تھا۔ ہریش کی آنکھ کھل گئی اور حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے کئی بار اس ہنسی کی وجہ دریافت کی لیکن پرکاش نے سانس تک نہ لی اور ہنستا ہی رہا۔ ہریش بھی اس کے ساتھ ہنسنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ بولا "بس کرو بھائی، بس کرو، میرے تو پیٹ میں بھی درد ہونے لگا۔ آخر تم کیوں ہنس رہے ہو، مجھے بھی تو بتاؤ۔" پر کاش کی ہنسی رکنے ہی میں نہ آتی تھی۔ اس نے ہنستے ہنستے کہا "مس سوشیلا! نمستے" اور ایک زور کا قہقہہ لگایا۔

مس سوشیلا کا نام سنتے ہی ہریش چونک اٹھا۔ پہلے تو گھبرایا۔ لیکن پھر خود ہی بولا "اس کا مطلب؟"

"اس کا مطلب؟" اسی طرح مسلسل ہنستے ہوئے پرکاش نے کہا "اسکا

مطلب یہ ہے کہ تمہارے سامنے منوہ ما بیٹھی ہے!"

ہریش نے اُس کی طرف دیکھا اور ایک ثانیہ بعد وہ بھی پرکاش کے ساتھ ہنسنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد جب دونوں تھک گئے تو ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اُن کے لئے اب کچھ سمجھنا باقی نہ رہا تھا۔ دونوں میں سے ایک کو بھی صفائی میں کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ حقیقت منکشف ہو چکی تھی۔

# خواہش

میں اپنی طرز کا واحد افسانہ نگار تھا۔ شہروں کے علاوہ دیہاتوں میں بھی میرے افسانے شوق سے پڑھے جاتے تھے۔ اخبارات و رسائل کے ایڈیٹر میرے افسانے زیادہ سے زیادہ معاوضہ دے کر مجھ سے حاصل کرتے اور فخر کے ساتھ شائع کرتے۔ میرا نام چوٹی کے افسانہ نگاروں کی صفِ اول میں تھا۔ افسانے لکھنے کے سوا مجھے کوئی کام نہ تھا۔ میں نے اسے ایک قسم کا پیشہ بنالیا تھا۔ اور اسی ذریعہ سے میں کافی روپیہ کما رہا تھا۔ "بدھوار پیٹھ" پر ایک شاندار چھوٹا سا مکان تھا۔ میرا خیال تھا کہ جیسے میں اپنے افسانوں میں خیالات کا سہارا لیتا ہوں اسی طرح میرے افسانوں کو شوق سے پڑھنے والے بھی میرے مکان کی زیب و زینت کے متعلق ضرور خیال کرتے ہوں گے کہ اس کا مکان بھی زیب و زینت کے لحاظ سے نہایت شاندار ہوگا۔ لہٰذا اسی خیال کے ماتحت میں نے اپنا مکان خوب خوب سجا رکھا تھا۔

لیکن میرے مکان کی سجاوٹ پر میرے دوستوں کو اعتراض تھا۔ ان کا

خیال تھا کہ گھر کو چاہے کتنا ہی کیوں نہ سجایا لیا جائے لیکن عورت کے بغیر سونا ہی رہتا ہے۔ میں اُن کے اس خیال سے متفق تو ضرور تھا لیکن میں بغیر سوچے سمجھے شادی تو ایک طرف کسی عورت کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھنے کا بھی روادار نہ تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اپنے افسانوں کی ہیروئن ایسی ہیروئن چاہتا تھا جو حدیث محبت کے نکات و رموز سے مکمل طور پر واقف ہو۔ لیکن مجھے ابھی تک ایسی ہیروئن نہیں ملی تھی۔ میری نگاہیں ہر لمحہ ہر وقت اسی کی تلاش میں سرگرداں رہتیں اور یہی وجہ تھی کہ میں نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ اگر میرے خیال کے مطابق کوئی لڑکی مل جاتی تو میں اب تک یقیناً شادی کر لیتا اور دوستوں کو اتنا کہنے کا موقع بھی نہ ملتا۔

برسات کا مہینہ تھا۔ ان دنوں پونا کی بہار دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ بمبئی سے بہت سے لوگ ان دنوں سیر کی غرض سے یہاں آتے ہیں۔ ندی کے کنارے، باغوں میں، سینماؤں میں خوب چہل پہل دکھائی دیتی ہے۔

صبح کا وقت تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ میں چائے پی کر براڈ گارڈن میں گھومنے کیلئے نکل پڑا۔ براڈ گارڈن ایک چھوٹا سا پارک ہے۔ لیکن ندی کے کنارے بند کے قریب ہونے کے باعث نہ صرف سیر و تفریح کے قابل ہے بلکہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

براڈ گارڈن کے اندر داخل ہوتے ہی میری نگاہیں سامنے بنچ پر جا پڑیں اور پھر واپس پلٹنے کی بجائے وہیں پر جم کر رہ گئیں۔ بنچ پر ایک خوبصورت لڑکی بیٹھی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ میں نے اپنی نگاہوں کو وہاں سے ہٹانا چاہا لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے کسی نے میرے کان میں کہہ دیا ہو "ٹھہرو۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"دیکھو!" پھر کسی نے جیسے میرے کان میں کہا۔

لڑکی کتاب کے مطالعہ میں بے حد منہمک تھی۔ لیکن اُس کا چہرہ مجھے صاف طور پر نظر آرہا تھا۔ میں کچھ دیر تک اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ پڑھتے پڑھتے لڑکی نے کتاب کچھ اس انداز سے اپنے سامنے کرلی کہ اُس کا چہرہ کتاب کی اوٹ میں چھپ گیا۔ اور میں آگے چل پڑا۔ کسی نے میرے کان میں پھر کہا۔

"ٹھہرو!"

"کیوں؟" میں نے پھر پوچھا۔

"اندھے ہو!"

"کیوں؟"

"یہ وہی ہے جس کی تمہیں تلاش ہے۔"

"یہ وہی ہے' یہ وہی ہے جس کی تمہیں تلاش ہے۔" مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہر برگ و شجر' ننھے ننھے پودے' لچک دار بیلیں' پھول' ندی کا آبِ رواں ہوا کے جھونکے' غرض کہ پارک کا ذرّہ ذرّہ پکار پکار کر کہہ رہا ہو۔ "یہ وہی ہے' یہ وہی ہے جس کی تمہیں تلاش ہے۔" میں چلتا چلتا رک گیا پھر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ سوچا' شاید میرے تخیلات کی یہی وہ حسین محبوبہ ہے۔ جس کی تلاش میں ایک عرصہ سے میں سرگرداں ہوں...... کیا واقعی یہ وہی ہے یہ وہی ہے......"

میں آہستہ آہستہ بنچ کے پاس پہنچ گیا۔ وہ بنچ کے ایک کونے پر بیٹھی تھی میں کھانسا۔ مگر اُس نے ذرا بھی جنبش نہ کی۔ میں نے ایک پاؤں بنچ پر رکھ کر جراب اوپر چڑھائی مگر اُس نے میری طرف اس بار بھی توجّہ نہ کی۔ میں اُسے اپنی طرف متوجّہ کرنے کے لئے بیتاب ہو اٹھا۔ آخر ایسی کونسی کتاب ہے جو اُسے میری طرف متوجّہ نہیں ہونے دیتی؟ میں دل ہی دل میں کتاب کے مصنف کو گالیاں دینے لگا۔ شاید

وہ بھی کوئی افسانہ نگار ہی ہو۔ اس خیال سے میں کتاب کا نام دیکھنے کے لئے قدرے جھکا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ کتاب میری ہی لکھی ہوئی تھی۔ پہلے تو مجھے اپنے آپ پر غصہ آیا۔ پھر ہنسی آئی اور پھر مجھے خوشی بھی ہوئی۔ چھپانے سے کیا فائدہ؟ غرور سے میرا سر قدرے اونچا ہو گیا۔ یہ میرے ہی لکھے ہوئے افسانے تھے جو اُسے اپنی طرف متوجہ کئے ہوتے تھے۔ میرے افسانوں کو جب وہ اتنی دلچسپی سے پڑھتی ہے تو کیا میری باتوں کی طرف ذرا بھی متوجہ نہ ہوگی؟ میں یہ سوچ کر ایک گہری سوچ میں پڑ گیا اور نہ جانے کب میں بنچ کے دوسرے کونے پر سمٹ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا ـــــ بیٹھا رہا اور کنکھیوں سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر جھجک دور ہو گئی اور میں سمٹ کر بیٹھنے کی بجائے اس کی طرف تھوڑا سا کھسک کر آرام سے کھلا ہو کر بیٹھ گیا۔ میں ایک بار پھر کھانسا لیکن اس کی نگاہیں کتاب پر سے نہ ہٹیں۔ کچھ دیر ٹھہر کر آخر مجھے بولنا ہی پڑا۔

"آج کا موسم تو بہت دلفریب ہے!"

وہ چپ رہی۔ میں بھی کچھ دیر تک خاموش رہا۔ پھر بولا "بادل تو خوب گھرے ہوتے ہیں۔ شاید برسنے لگیں"

اس مرتبہ بھی وہ چپ رہی۔ میں نے جیب سے گھڑی نکالی اور اُسکی سوئی کو پیچھے پھرا کر کہا "اُف، یہ کیا؟ گھڑی ابھی دو ہی بجا رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بند ہو گئی"

مگر شاید اُس نے نہ بولنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ وہ بولی "نہیں" مگر اس مرتبہ کتاب کی اوٹ سے آدھی آنکھ اوپر کو اٹھا کر اُس نے ایک بار میری طرف دیکھا۔ میری ہمت بڑھ گئی۔ میں بولا "معاف کیجئے گا۔ کیا آپ کے پاس گھڑی ہے؟"

"ہے" وہ آہستہ سے میری طرف دیکھے بغیر ہی بولی اور پھر چپ ہو گئی۔

کتاب اُس کے چہرہ کے لیئے اچھا خاصہ نقاب بنی ہوئی تھی۔ اگر وہ کتاب میری لکھی ہوئی نہ ہوتی تو اس مرتبہ یقیناً اُس کے مصنف کو جی بھر کر گالیاں دیتا۔

آخر میں بولا۔" میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔ یہ بھی نہ سوچا کہ پڑھی لکھی عورتیں گھڑی ضرور رکھتی ہیں۔ مجھے سیدھی طرح وقت پوچھنا چاہیئے تھا۔ تھی نہ یہ میری بے وقوفی!"

"تھی" وہ بولی۔

کتنی شدید چٹکی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ میں ہی چٹکیاں لینے میں یکتا ہوں۔ لیکن اُس نے مجھے شکست دے دی۔ میں نے ذرا شرمندہ سا ہو کر پوچھا۔

"کیا آپ وقت بتا سکیں گی؟"

"ہاں" کہہ کر وہ پھر چپ ہو گئی۔

"کیا بجا ہے؟"

"ساڑھے چھ!" یہ کہہ کر اُس نے کتاب بند کر دی اور آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔

میں نے پوچھا۔"کیا کتاب ختم ہو گئی؟"

"ہو گئی"

"ناول ہے کوئی؟"

"افسانے"

"افسانوں سے آپ کو بہت دلچسپی ہے؟"

"بہت"

"کیا نام ہے کتاب کا؟"

"گلاب کی کلیاں"

"نام کو بہت پیارا ہے!"

"بہت"

"لکھنے والا کیسا ہے؟"

وہ جواب دینا ہی چاہتی تھی کہ پھوار پڑنے لگی اور وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔

"کیا چل پڑیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں!"

"بارش کے ڈر سے؟"

"گھر بھی پہنچنا ہے نہ۔"

"میرے ساتھ چلنا اگر ناگوار نہ ہو تو میری کار باہر کھڑی ہے۔ کہیں تو گھر تک پہنچادوں؟"

"تمہاری کار؟" اُس نے حیرت سے کہا۔ اُسے یقین نہ ہوا کہ میرے پاس بھی کار ہو سکتی ہے۔ میں بولا۔

"ہاں! میری کار!"

"میری بھی کار آنے والی تھی۔ شاید آگئی ہو۔" اُس نے میرا مذاق اڑایا۔

"تمہاری کار؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"ہاں میری کار!" وہ زور سے بولی۔

"مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ کے پاس بھی کار ہو گی؟"

"تم نے مجھے کیا سمجھا ہے؟" وہ اکڑ کر بولی۔

"تمہیں؟ بتاؤں؟"

"تمہارے بتلانے کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی تمہیں بتلائے دیتی ہوں؟"

"بتاؤ۔"

"میں دنیا کی ایک خوش حال عورت ہوں۔"

"عورت؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہاں عورت!"

"عورت؟ تمہیں شاید اپنے متعلق کچھ غلط فہمی ہے عورت نہیں لڑکی ہو۔"

"عورت، لڑکی نہیں عورت!"

"تو کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟"

"بہت دن ہوگئے!"

"اور وہ خوش نصیب کون ہے؟"

وہ کچھ سٹپٹائی۔ میں سمجھ گیا کہ اُس نے جھوٹ بولا ہے۔ اُس نے اتنا کہہ دیا۔ مگر اُسے اس سوال کی مجھ سے امید نہ تھی۔ اُس نے سٹپٹاتے ہوئے کتاب کی طرف دیکھا ــــ دیکھا اور اُس کے ہونٹوں پر ایک دل کش مسکراہٹ کھیل گئی۔ وہ بولی۔

"وہ بہت قابل ہیں!"

"کوئی منسٹر ہیں؟"

"نہیں!"

"مل اونر ہیں؟"

"نہیں!"

"وکیل ہیں؟"

"نہیں!"

"پھر کیا ہیں وہ؟"

"ایک افسانہ نگار!"

"افسانہ نگار؟"

"ہاں! ایسا افسانہ نگار جس کے افسانے لوگ شوق سے پڑھتے ہیں۔ جس کے افسانے دل ہلا دیتے ہیں۔ جو ہنستوں کو رُلاتا ہے اور روتوں کو ہنساتا ہے"

"تم بڑی خوش نصیب ہو جو تمہیں ایسا شوہر ملا۔ اُس کا نام کیا ہے؟"

اُس نے کتاب میری طرف بڑھا کر میرا نام مجھے دکھلاتے ہوئے کہا

"لو پڑھ لو"

"بلونت دلبلے؟ یہ تمہارے پتی؟"

"کیوں؟ کیا تم انہیں جانتے ہو؟" وہ گھبرا کر بولی۔

"جانتا ہوں؟ میں نے نام تک نہیں سنا۔ اچھا یہ بتاؤ۔ تم نے انہیں دیکھا ہے؟"

"دیکھا ہے؟ اس کا کیا مطلب؟ کوئی عورت اپنے پتی کو بھی نہیں پہچانتی؟"

"یہ بات نہیں، میرا مطلب ہے آج سے"

"میں ابھی انہیں گھر چھوڑ کر آئی ہوں"

"کیا وہ تمہارے ساتھ گھومنے نہیں آتے؟"

"وہ افسانہ لکھ رہے ہیں"

"اچھے پتی ہیں، اتنی خوبصورت بیوی کو تنہا گھومنے بھیج دیتے ہیں۔ کیا افسانے تم سے بھی زیادہ اُنہیں پیارے ہیں؟"

"دیکھو! تم میرے پتی کے بارے میں ایسے الفاظ نہ کہو" وہ غصّہ کے لہجہ میں بولی۔

"کیا تمہیں ان سے اتنی محبت ہے؟"

"اپنی جان سے بھی زیادہ۔ میں ہی کیا جو کوئی اُن کے افسانے پڑھتا

ہے یہی کہے گا۔"

"میری بد قسمتی ہے کہ میں نے اُن کے افسانے نہیں پڑھے۔"

ہلکی ہلکی پھوار بوندیں بن کر برسنے لگی۔ وہ بولی۔"میری کار آگئی ہوگی۔ پیارے اب میں چلتی ہوں۔"

"تو اب ملنا تو ہوگا ہی نہیں۔ کیونکہ تم ایک بہت بڑے آدمی کی بیوی ہو اور میں ایک معمولی آدمی ہوں۔"

"نہیں" یہ کہہ کر وہ تیزی سے پھاٹک کی طرف چل پڑی۔

---

میں نے دیکھا وہ مجھے اپنے پیچھے نہ دیکھ کر چپ چاپ شہر کو جانے والی سڑک چھوڑ کر چھاؤنی کو جانے والی سڑک پر ہولی۔ میں نے کار میں بیٹھ کر ڈرائیور کو اسی سڑک پر آہستہ آہستہ چلنے کو کہا۔۔۔ میرے سامنے ایک ڈرامہ کھیلا جا رہا تھا۔ اور وہ ڈرامہ بہت ہی دلچسپ تھا۔ مجھے امید نہ تھی کہ وہ ملے گی اور اس طرح ملے گی۔ میں نے سینکڑوں افسانے لکھے تھے۔ مگر اتنا دلچسپ پلاٹ مجھے نہ سوجھا تھا۔ وہ اپنے آپ کو میری بیوی بتا رہی تھی۔ لیکن پھر بھی میں اُسے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ تم میری ہو۔۔۔ کتنا دلچسپ ملاپ تھا یہ! میں اس پر فریفتہ ہو گیا۔ کیا وہ میری ہم خیال نہیں تھی؟ اس کے دل میں محبت اور آنکھوں میں ایک محبت بھرا پیغام پوشیدہ تھا۔ وہ سرتاپا دلکشی و رعنائی کا ایک حسین ترین مرقع تھا جو عورت ان تین خوبیوں کی حامل ہو اُسے اگر ایک افسانہ نگار پیار کرنے لگے تو اُس میں اس کا کیا قصور؟

بارش تیز ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا وہ بھیگتی ہوئی ایک درخت کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ میں نے اُس درخت کے پاس کار کو رکوا کر اُس کی طرف والا دروازہ

کھولا۔ وہ مجھے دیکھ کر جھجکی۔

"تم یہاں بھی آ گئے!" وہ بولی۔

"تمہیں کھینچ لائی ہو!"

"اگر میرے پتی یہاں ہوتے تو تمہیں یہ کہنے کی جرأت نہ ہوتی!"

"میری خواہش ہے کہ میں ان کے درشن کروں۔ کیا ان سے ملاؤ گی نہیں؟"

"نہیں، تم اس قابل نہیں کہ اُن سے مل سکو۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ تم دوسرے کی عورت سے اس قسم کی باتیں کہتے ہو!"

"یہ تو تمہارے پتی کا قصور ہے!"

"میرے پتی کا، کیا وہ تم سے ایسا کرنے کو کہہ گئے ہیں؟"

"کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ تمہاری کچھ بھی پرواہ نہیں کرتے۔ تم یہاں بارش میں بھیگ رہی ہو اور وہ اپنی افسانہ نگاری میں مست ہیں!"

"اس سے تمہارا مطلب؟"

"مطلب تو کچھ نہیں۔ لیکن تمہیں بھیگتے ہوئے نہیں دیکھا جاتا۔ تمہاری موٹر کا کیا ہوا؟"

"آئی نہیں!"

"کیا افسانہ لکھنے میں کار بھیجنی بھول گئے؟"

"شاید ایسا ہی ہو!"

"تو اب کیا خیال ہے؟"

"گھر جا رہی ہوں۔"

"پیدل؟"

"ہاں!"

"بارش میں بھیگتے ہوئے؟"

"موم کی تھوڑی ہی بنی ہوئی ہوں جو پگھل جاؤں گی۔"

"موم پانی سے تو نہیں پگھلتا۔ لیکن تم شہد کی بنی ہوئی ہو۔ ساری مٹھاس گھل جائے گی۔ ایک بات مانو گی؟"

"کیا؟"

"میری کار میں بیٹھ جائیے۔ گھر پہنچائے دیتا ہوں۔"

"نہیں!"

"ڈرتی ہو؟"

"ڈرتی ہوں؟ کس سے؟"

"مجھ سے!"

"تم سے! میں ڈروں گی؟"

"تو پھر کار میں کیوں نہیں بیٹھتیں؟"

"میرے پتا کو معلوم ہو گیا تو پھر تمہاری خیر نہ ہو گی؟"

"یہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ اس کی فکر نہ کرو۔ دیکھو کچھ سردی محسوس کر رہی ہو۔ بیٹھو گی؟"

بھیگتے ہوئے جسم پر ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکوں کے تھپیڑوں سے وہ شدت کی سردی محسوس کر رہی تھی۔ وہ کچھ کہے بغیر ہی موٹر کے اندر آ جا کر بیٹھ گئی۔

"کدھر کو؟" میں نے پوچھا۔

"بازار میں اتار دینا۔ وہاں سے تانگہ پر سوار ہو کر گھر چلی جاؤں گی۔"

"میری موٹر گھر تک جا سکتی ہے۔"

"میں وہاں تک موٹر لے جانا نہیں چاہتی۔"

"کیوں؟"

"میرے پتی مجھے تمہارے ساتھ دیکھ لیں گے تو؟"

"سڑک کے کنارے پر اُتر جانا۔"

"چلو!"

"پتہ کیا ہے؟"

"تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں ہے؟"

"میں کہہ چکا ہوں کہ میں بلونت دا ملے سے کبھی نہیں ملا۔"

"تمہارے ڈرائیور کو معلوم ہوگا۔"

"پوچھتا ہوں۔"

میں ڈرائیور سے پتہ معلوم کرنے کے بہانے سے نیچے اتر آیا اور اُس نے اُس وقت تک کتاب کھول کر پتہ دیکھ لیا۔ میں جب کار کے اندر داخل ہوا تو وہ بولی۔

"پوچھ لیا؟"

"ہاں!" میں نے جواب دیا۔

"کیا ہے؟"

"۲۱ بدھوار پیٹھ۔"

"ڈرائیور ہوشیار معلوم ہوتا ہے۔"

"وہ کہتا ہے کہ میرے یہاں آنے سے پہلے وہ انہی کے ہاں نوکر تھا"
"اُن کے یہاں نوکر؟ کتنے دنوں کی بات ہے؟" اُس نے چونک کر پوچھا۔
"دو برس کی بات ہے۔ اُس نے تمہیں وہاں کبھی نہیں دیکھا؟"
"نہیں۔ ۔ ۔ میں ۔ ۔ ۔ وہاں نہیں تھی۔ میرا بیاہ ہوئے ابھی چند ہی مہینے ہوئے ہیں"

"اوہ! ایسا ہے"

کچھ دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔ شہر تھوڑی ہی دور رہ گیا تھا۔ میں نے کچھ اور بات چیت کرنا چاہی۔

"بلونت دا ملے بہت ہی خوش نصیب ہیں کہ انہیں تم ایسی بیوی ملی"

"ایسی میری قسمت کہاں کہ وہ مجھے قبول کر سکیں" وہ مایوس کن لہجہ میں بولی۔ شاید وہ بھول گئی تھی کہ وہ کون تھی۔ میں نے چڑانے کی غرض سے اُس سے پوچھا "قبول کر سکیں؟ اس کا کیا مطلب؟ قبول تو انہوں نے تمہیں شادی ہی کے وقت کر لیا ہوگا"

وہ چونک اٹھی جیسے بینس سے جاگی ہو۔

"کیا کہا تھا میں نے قبول کر سکیں؟ نہیں نہیں۔ میرا مطلب تھا کہ ۔ ۔ ۔ کہ ۔ ۔ ۔ ۔"

میں نے اس فقرہ کو مکمل کر دیا "پریم کر سکیں"

"ہاں ہاں! میرا یہی مطلب تھا"

"تو کیا انہیں تم سے پریم نہیں؟"

"نہیں نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ اُدھ

بھی زیادہ پریم کر سکیں۔"

"اپنے افسانہ نگار پتی کے بارے میں کچھ اور نہ بتاؤ گی؟"

"کیا؟"

"وہ نوجوان ہیں؟"

"ہاں!"

"خوبصورت؟"

"یقیناً۔"

"میں بھی اگر افسانہ نگار ہوتا۔"

"تو کیا کرتے؟"

"بھیک مانگتا۔"

"کس چیز کی؟"

"پریم کی"

"کس سے؟"

"تمہاری ایسی خوبصورت لڑکی سے۔"

وہ ہنس کر بولی۔ "تم بہت دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہو تم افسانے کیوں نہیں لکھتے؟"

"لکھنے نہیں آتے۔"

"تم نے کبھی لکھنے کی کوشش ہی نہ کی ہوگی۔ تمہاری باتوں سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ تم اچھے افسانہ نگار بن سکتے ہو۔"

"یہ تم دل سے کہہ رہی ہو؟"

"دل سے!"

"اچھا کوشش کروں گا۔ لیکن کیا اس کے بعد تم اپنے دل میں مجھے تھوڑی سی جگہ دے سکو گی؟"

"شاید!" وہ اپنا سر موٹر کی گدی پر رکھتے ہوئے بولی۔

"لیکن..... تم تو شادی شدہ ہو؟"

اُس نے جلدی سے اپنا سر اوپر اٹھایا اور کچھ جواب دیئے بغیر باہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی: "بدھوار پیٹھ آگیا۔ کار رکوا کر مجھے اتار دو۔"

"یہاں اترنے سے کیا فائدہ؟ سامنے ۱۲ نمبر ہے۔"

کار نمبر ۱۲ کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔

"یہی ہے نا تمہارا مکان؟" میں نے کار سے نیچے اتر کر اپنے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھہرو!" یہ کہہ کر وہ دروازہ کی طرف گئی اور میرے نام کا سائن بورڈ دیکھ کر بولی: "ہاں یہی ہے۔ اب تم جاؤ۔"

"تمہیں اپنا مکان بھی یاد نہیں رہتا۔"

"ذرا اندھیرا تھا نہ۔"

"لیکن میں اسے شاید پہچانتا ہوں۔"

"تم پہچانتے ہو؟"

"ہاں! معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے!"

"کیا تم کبھی یہاں آتے تھے؟"

"کئی بار۔"

"کس لئے؟"

"چوری کرنے!"

"چوری؟" اُس نے تیزی سے کہا۔

"ہاں!"

"اس کا کیا مطلب؟"

"میں چور ہوں!"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بولی: "معاف کرنا، میں اپنی ہنسی نہیں روک سکی۔" آپ اور چور؟ مجھے بنا رہے ہیں آپ، چور کی سی شکل ہے نا آپ کی؟"

"تو کیا چور کی شکل پر چور لکھا ہوتا ہے؟"

"لکھا تو نہیں ہوتا۔ لیکن اتنے شاندار لباس میں جو شخص ملبوس ہو، اسے لوگ چور کہہ سکتے ہیں؟ جو اتنی قابلیت سے بلا جھجک باتیں کر سکتا ہو، کیا وہ چور ہو سکتا ہے؟"

کیوں نہیں! تم نے چور دیکھے ہی نہیں۔ چوری مختلف طریقوں سے کی جاتی ہے۔ کوئی باتوں باتوں میں سب کچھ اڑا لے جاتا ہے اور کوئی تالا توڑ کر، غرضکہ مختلف طریقے ہیں چوری کے۔ میں باتوں کے ذریعہ اور تالا توڑ کر یا کسی نہ کسی طریقہ سے مکان کے اندر داخل ہو کر چوری کرتا ہوں، اور چوری کے فن میں خوب ماہر ہوں!"

"اچھا تو آپ نے ہمارے یہاں سے کتنی چیزیں چُرائیں؟"

"بہت ہیں۔"

"پھر بھی؟"

"اس لباس ہی کو لو۔ یہ تو تمہارے یہاں سے چرایا تھا!"

"کیا؟"

"سچ! یہ کپڑے تمہارے پتی کے ہیں یا اور کسی کے ہوں گے لیکن

چرائے اسی گھر سے تھے۔ تم شاید ان دنوں اس گھر میں تھیں نہیں۔"

"اور؟"

"یہ موٹر۔"

"اور؟"

"اور باقی چیزوں کی چوری کے متعلق بتلانے سے معذور ہوں۔"

"کچھ اور تو بتاؤ؟"

"پوچھ کر ہی چھوڑو گی؟"

"کیا حرج ہے؟"

"لیکن مجھے اندیشہ ہے۔"

"کس بات کا؟"

"بھید کھلنے پر بدلہ کا۔"

"میں بھید نہیں کھولوں گی۔"

"سچ کہتی ہو؟"

"یقین مانیئے۔"

"میں نے ایک بیوی بھی چرائی ہے۔"

"بیوی؟" وہ ہنس کر بولی۔

"ہاں! میری تو تھی نہیں۔ لیکن بن گئی ہے۔"

"تم بڑے ویسے چور ہو۔ بس اب اور کچھ نہ چرانا۔"

"کہہ نہیں سکتا۔ شاید کچھ اور بھی چرانا پڑے۔"

"اچھا تم اب جاؤ۔ مجھے بھی دیر ہو رہی ہے۔ وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"تم جا سکتی ہو۔ بعد میں مَیں بھی چلا جاؤں گا۔"

مکان کا دروازہ بند تھا اور تالا لگا ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر تک کھڑی سوچتی رہی۔ میں بولا: "نوکر کو آواز دے لو وہ دروازہ کھول دے گا۔"

"نہیں! میرے پاس چابی ہے۔ میں قفل کھول لوں گی۔ تم جاؤ۔"

"جیب میں دیکھ لو۔ چابی ہے بھی یا نہیں؟"

اُس نے جیبیں ٹٹولنا شروع کیں اور کرتی بھی کیا؟ بے چاری بری طرح پھنس گئی تھی۔ کچھ دیر بعد بولی: "یہ برا ہوا۔ چابی کہیں گر گئی ہے۔"

"میری چابی لگا کر دیکھ لو۔ شاید کھل جائے۔"

"تمہارے پاس اس کی چابی کہاں سے آئی؟"

"چوروں کے پاس چابیوں کی کیا کمی؟" — یہ کہہ کر میں نے اپنی چابی سے قفل کھول دیا۔ وہ اندر داخل ہو کر بولی: "اس کرم فرمائی کا شکریہ!"

"یہ چابی بھی رکھ لو۔ شاید کام آجائے۔"

اُس نے چابی لے لی۔

"اب تو شاید کبھی کبھی درشن ہوتے رہیں گے؟"

"کیا چوری کرنے آؤ گے؟"

"خیال تو یہی ہے۔"

"تو اب خالی ہاتھ جاؤ گے۔"

"میں ایسا چور نہیں ہوں۔"

وہ ہنسی۔ دروازہ اندر سے بند کر لیا گیا میرا ہی گھر اور میں اندر داخل نہ ہو سکا۔

---

موٹر والے کو وہاں سے چلے جانے کے لئے کہہ کر میں ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ دروازہ کھول کر اپنے گھر کی طرف جائے گی۔ ہوا بھی ایسا ہی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ وہ باہر نکلی۔ اِدھر اُدھر دیکھا اور دروازہ بند کر کے اسٹیشن کی طرف چل دی۔ میں بھی اُس کے پیچھے چل پڑا۔ مادھو آشرم کے پاس وہ رکی۔ وہ پونہ کی رہنے والی نہیں تھی۔ اُسی دن بمبئی سے آئی تھی۔

---

رات بھر مجھے نیند نہ آئی۔ تنہائی کا احساس رہ رہ کر مجھے پریشان کر رہا تھا۔ آنکھوں میں اسی کا حسین سراپا رقص کر رہا تھا۔ آخر تنگ آ کر میں اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ بہت دیر تک ٹہلتا رہا۔ ٹہلتے ٹہلتے خیال آیا۔ کیوں نہ ایک افسانہ ہی لکھ لیا جائے۔

صبح تک میں نے ایک افسانہ ختم کر لیا۔ افسانہ کا عنوان تجویز کیا۔ "چور کا پریم" اس کا پلاٹ یہ تھا:۔

"چور ایک خوبصورت لڑکی کو براڈ گارڈن میں ملتا ہے۔ وہ لڑکی کہتی ہے، کہ وہ ایک افسانہ نگار کی بیوی ہے۔ چور کو اُس سے محبت ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ وہ شادی شدہ ہے۔ کچھ مایوس سا ہو جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے اُسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس خوبصورت لڑکی نے اُس سے جھوٹ بولا ہے۔ اسی اثنا میں کسی طرح افسانہ نگار کو بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک خوبصورت لڑکی خود کو اس کی بیوی ظاہر کرتی ہے تو وہ اس لڑکی سے ملتا ہے۔ افسانہ نگار مارا جاتا ہے اور چور اُس لڑکی سے شادی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔"

دوسرے دن صبح کو ڈاک سے مجھے عورت کا لکھا ہوا ایک خط ملا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں نے جلدی سے کھول کر اُسے پڑھا۔

مادھو آشرم پونہ
۱۳ ستمبر ۱۹۴۶ء

محترمی! نمستے

آپ مجھے نہیں جانتے۔ لیکن آپ کا نام ہر لمحہ، ہر وقت میری نوک زبان پر رہتا ہے۔ اس وقت تک آپ نے جتنے افسانے لکھے ہیں، میں نے سب کے سب پڑھے ہیں۔ ایک بار نہیں بلکہ کئی بار۔ اور جتنی بار انہیں پڑھا ہے۔ ہر مرتبہ اُن میں ایک نئی دلچسپی محسوس کی ہے۔ مجھے آپ سے شکایت ہے کہ آپ کثرت سے افسانے کیوں نہیں لکھتے۔ کیونکہ آپ جتنے افسانے ایک سال میں لکھتے ہیں، میں اتنے ایک دن میں بآسانی پڑھ لیتی ہوں۔ مجھے آپ سے ملنے کا بھی بہت اشتیاق ہے اور اسی غرض سے میں بمبئی سے پونہ آئی ہوں۔

میں یہ خط لکھ کر آپ کو تکلیف نہ دیتی۔ لیکن کل میں ایک حادثہ کا شکار ہو گئی تھی۔ جو آپ کی ذات سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے یہ خط لکھا گیا ہے۔ امید ہے آپ معاف فرمائیں گے۔

کل میں سیر کی غرض سے برا دگارڈن میں گئی، تو مجھے ایک چور ملا اور مجھے جب تنگ کرنے لگا تو میں نے اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "تم کس خیال میں ہو، میں شری یت بلونت دا ملے کی بیوی ہوں۔" میں نے یہ جھوٹ اس لئے بولا تھا کہ وہ ڈر جائے۔ لیکن وہ بہت ہی نڈر چور معلوم ہوتا ہے۔ مجھے مجبور کر کے اپنی کار میں بٹھا کر آپ کے گھر تک لے گیا۔ مجبوراً مجھے آپ کے گھر میں داخل ہونا ہی پڑا۔ آپ کے قفل کی چابی بھی اُسی نے دی تھی۔ جب وہ چلا گیا تو میں اپنے ہوٹل میں واپس آئی۔

میں آپ کی غیر حاضری میں بلا اجازت آپ کے مکان میں داخل ہوئی۔
میں اس کی معافی چاہتی ہوں۔ میں اس وقت ایسا کرنے پر مجبور تھی۔ امید ہے
آپ معاف فرمائیں گے۔

میں آپ کو ایک تکلیف اور دینا چاہتی ہوں۔ رات کو مجھے نیند نہیں
آئی تھی اور میں نے ایک افسانہ لکھ ڈالا۔ اس کا نام میں نے "افسانہ نگار کا
پریم" رکھا ہے۔ اس سے پہلے مجھے کوئی پلاٹ سوجھا ہی نہیں تھا اور نہ ہی میں
نے کبھی کوئی افسانہ لکھا ہے۔ یہ میری پہلی کوشش ہے جو آپ کی خدمت میں
ارسال ہے۔ ہاں! معاف کیجیے گا اس افسانہ میں آپ کا بھی ذکر آگیا ہے لیکن
آخر ہے تو ایک افسانہ ہی۔ افسانے اکثر سچے نہیں ہوتے۔

میں کل صبح آپ کے درشن کرنے آ رہی ہوں۔ امید ہے آپ میری
دلی آرزو کو پورا کرنے کی خاطر مکان پر ہی رہیں گے۔

خیر اندیش ــــــ چندر پربھا

خط پڑھنے کے بعد میں نے افسانہ کھولا۔ افسانہ مختصر ہی تھا۔ صرف
چار صفحات پر مشتمل تھا۔ لیکن تھا بہت ہی دلچسپ۔ جو پلاٹ میرے افسانے
کا تھا، وہی اس کے افسانے کا تھا۔ اگر فرق تھا تو صرف اتنا کہ میرے افسانے
کے انجام میں افسانہ نگار مارا جاتا ہے اور چور کامیاب ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے
افسانہ کے انجام میں افسانہ نگار چور کو زہر دے کر مار دیتا ہے اور اس لڑکی
سے شادی کر لیتا ہے۔ افسانہ پڑھنے کے بعد میں خوب ہنسا۔ بات ایک ہی
تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اسے مجھ سے محبت ہے۔ چور کے روپ میں نہ سہی،
افسانہ نگار کے روپ میں سہی۔ میں نے اس کا خط ایک بار پھر پڑھا۔ مجھے
ایسا محسوس ہوا۔ جیسے اس میں بھی یہی لکھا تھا" یہ وہی ہے۔ جس کی سب مجھے

تلاش ہے۔"

---

میرے لئے وہ رات بہت ہی طویل تھی۔ ہمارا تعارف ہوئے ابھی مشکل سے بارہ گھنٹے گذرے ہوں گے۔ لیکن میں اُس کے آنے کا اتنی بیصبری سے انتظار کر رہا تھا۔ جیسے وہ برسوں سے مجھ سے متعارف ہو۔ آخر مجھ جیسے کی نگاہوں میں وہ مجھ افسانہ نگار کی بیوی ہی تو تھی۔

صبح ہوئی۔ نوکر نے آکر کہا "وہ آئی ہیں۔"

"انہیں بیٹھک میں بٹھا دو۔ اور دیکھو جب تمہیں گھنٹی کی آواز سنائی دے تو یہ پیکٹ باہر سے بیٹھک میں پھینک دینا۔"

"بہت اچھا۔"

"نوجیون" کے تازہ پرچہ کے سرورق پر میری تصویر چھپی تھی۔ میں نے اُسی پرچہ کا پیکٹ نوکر کو دے دیا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی کسی رسالہ کو اپنی تصویر اشاعت کے لئے نہ دی تھی۔ لیکن چونکہ "نوجیون" کا یہ پرچہ "افسانہ نمبر" تھا۔ مجبوراً مجھے اپنی تصویر دینا ہی پڑی۔

یہ کام کر کے میں آہستہ آہستہ نیچے اترا۔ سیڑھیاں بیٹھک ہی میں ختم ہوتی تھیں۔ میں نے دیکھا۔ وہ نہ جانے کن خیالات میں الجھی ہوئی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے پاؤں کی چاپ سنتے ہی وہ چونکی اور جلدی سے اُٹھ کر سیڑھیوں کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اُس کے چہرے پر زردی سی چھا گئی۔ اُسے میرے وہاں ہونے کی قطعاً امید نہ تھی۔ وہ گھبرا کر بولی۔ "تم!"

"ہاں میں!"

"تم یہاں کیسے آ پہنچے؟"
"چور کبھی یہ بھید نہیں بتاتا۔"
"یہاں کیا کر رہے ہو؟"
"تمھیں ڈھونڈ رہا تھا۔ ایک بار تمہیں پھر دیکھنا چاہتا تھا۔"
"اچھا! تم نے مجھے اب دیکھ تو لیا۔ اب جاؤ۔"
"کیوں، اتنی جلدی؟"
"میرے پتی آتے ہی ہوں گے۔"
"نہیں ابھی یہاں آنے میں ایک گھنٹہ صرف ہوگا۔"
"نہیں! تم نہیں جانتے، ہمیں کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں، وہ ابھی آ رہے ہیں۔"
"نہیں! وہ ابھی نہیں آ رہے ہیں۔ افسانہ نگاروں میں یہ بیماری عام ہے۔ اس وقت وہ افسانہ لکھنے میں محو ہیں۔ جب تک افسانہ ختم نہ ہوگا۔ وہ یہاں نہیں آئیں گے۔"
"اور تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہے؟"
"میں انہیں کے پاس سے آ رہا ہوں۔"
"اُن کے پاس سے؟ وہاں تم کیا کر رہے تھے؟"
"ایک افسانہ دکھانے آیا تھا۔"
"افسانہ؟ اپنا؟"
"ہاں! تمہارے کہنے کے مطابق رات کو میں نے ایک افسانہ لکھا تھا۔"
"ذرا دکھانا!"

میں نے افسانہ اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔

اُس نے پڑھ کر کہا: "یہ ہے تمہارا افسانہ، اور یہ ہے اُس کا انجام؟"

"اور کچھ مجھے سوجھا ہی نہیں۔"

"میں نے بھی رات کو ایک افسانہ لکھا تھا۔"

"افسانہ نگار کا پریم؟"

"تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟" وہ چونک کر بولی۔

"تمہارے پتی کے پاس سے چرا لایا ہوں۔"

"کیا تم نے اُسے پڑھ لیا ہے؟"

"نہیں! ابھی تو نہیں پڑھا۔ لیکن اب پڑھوں گا۔"

"نہیں نہیں، وہ تمہارے کام کا نہیں۔ اُسے مجھے واپس کر دو۔"

"چوری کی ہوئی چیز کبھی چور واپس نہیں دیتا۔"

"میں نے افسانہ پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ وہ میرے پاس آکر بولی

"ذرا ٹھہرو!"

"کچھ کہنا ہے۔"

"کیا کوئی راز کی بات ہے؟ کہو؟"

"میں بلونت داملے کی بیوی نہیں ہوں۔"

"سچ کہتی ہو؟"

"سچ میں صرف بن رہی تھی۔"

"مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ تم غیر شادی شدہ ہو۔ میں نے تمہارا افسانہ پڑھ لیا تھا۔"

"تم نے پڑھ لیا تھا؟"

"ہاں!"

"تو تم جانتے تھے؟"

"ہاں!"

"پھر اس طرح بن کیوں رہے تھے؟"

"صرف تمہارے منہ سے سننے کے لئے۔"

"اچھا اب تم جاؤ۔ مجھے داملے سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

"اب جانے کو کہتی ہو۔ بھول گئیں۔ کل کیا کہا تھا؟ تمہارے کہنے سے افسانہ بھی لکھ لایا اور اب تم کسی کی بیوی بھی نہیں ہو۔ کیا میرے افسانہ کا انجام سچا نہ ہوگا؟"

"تمہاری یہ خواہش ہے؟"

"تم نے میرا افسانہ بھی پڑھا ہے۔ کیا اُس کا انجام سچا نہ ہوگا؟"

"تمہاری یہ دلی خواہش ہے؟"

"ہاں!"

"اس کا مطلب ہے کہ داملے سے تمہیں دلی محبت ہے۔"

"ہاں!"

"اچھا!" کہہ کر میں آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ بولی: "میں نہیں جانتی کہ تم کون ہو؟ کیسے ہو؟ لیکن اس کے باوجود مجھے تم پسند ہو۔ مگر مجھے داملے کے نام سے محبت ہے۔"

"تم نے کبھی داملے کو دیکھا ہے؟"

"نہیں!"

"تمہیں کچھ معلوم ہے کہ وہ کیسے ہیں؟"

"نہیں!"

"وا ملے بہت ہی بُرا آدمی ہے۔"

"کیوں؟"

"تم اگر انہیں ایک بار دیکھ لو تو تم اُن سے یقیناً متنفر ہو جاؤ۔"

"ایسا اُن میں کونسا عیب ہے؟"

"ایک عیب ہے، بتاؤں؟ اُن کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہو گی۔ اُن کے سامنے کے تین دانت ٹوٹے ہوئے ہیں۔ ناک پچکی ہوئی ہے۔ سر کے بال ایک چوتھائی رہ گئے ہیں اور بائیں ہاتھ کی دو انگلیاں کٹی ہوئی ہیں۔"

"اور کچھ؟"

"تمہارے لئے اتنا ہی کافی نہیں؟"

"نہیں! اگر وہ ایک سو پچاس برس کے ہوں۔ سامنے کے سب دانت ٹوٹے ہوئے ہوں۔ ناک پچکی ہوئی کی بجائے بالکل کٹی ہوئی ہو۔ سر پہ ایک بھی بال نہ ہو اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کٹی ہوئی ہوں، پھر بھی میں اپنا خیال نہیں بدل سکتی۔"

"اُن سے تمہیں اس قدر محبت ہے؟"

"ہاں!"

"میری بدقسمتی ہے کہ میں وا ملے نہیں ہوں۔ نہیں تو تم ایسی خوبصورت دوشیزہ پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دیتا۔"

میں نے آہستہ سے گھنٹی بجائی اور نوکر نے "نوجیون" کے افسانہ نمبر کا وہ پیکٹ کمرے کے اندر اس خوبی سے پھینک دیا، جیسے اکثر ڈاکیہ پھینک جاتا ہے۔ میں نے اُسے فرش پر سے اٹھا کر اُس کے اُوپر کے کاغذ کو پھاڑنا چاہا کہ وہ

بول اٹھی: تم اُن کی ڈاک کیوں کھولتے ہو۔

"ذرا پڑھنا چاہتا تھا۔ لو تم کھولو تمہیں ان پر کچھ حق بھی حاصل ہے۔"

اُس نے پیکٹ کھولا۔ اگر بجلی اس کمرے میں گرتی تو اُسے اتنی حیرت نہ ہوتی۔ جتنی سرورق پر میری تصویر دیکھ کر ہوتی۔ اُس نے ایک بار تصویر کو دیکھا پھر مجھے دیکھا۔ پھر تصویر کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف۔ میں اُس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "میری طرف ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟"

"اچھا تو تم ہی بلونت دا ملے ہو؟" وہ بولی۔

میں نے اپنی نگاہوں کو جھکاتے ہوئے کہا: نہیں چندر پربھا! میں اب بھی وہی چور ہوں۔ میں نے دا ملے کا سب کچھ چرا لیا ہے' اُس کا جسم' اُس کا دل' اُسکی روح میں تمہارے سامنے اب بھی ایک چور کی حیثیت رکھتا ہوں۔ کیونکہ میں ابھی ایک اور چیز چرانا چاہتا ہوں۔ تمہاری محبت!"

وہ چپ چاپ سرکر کر صوفے پر بیٹھ گئی جیسے وہ ایک طویل مسافت طے کر کے آئی ہو۔ میں صوفے پر جھک کر بولا' پربھا! تم خوش نہیں ہو؟"

"خوش؟ ہاں!..... نہیں..... ہاں..... اوہ! میں نہیں جانتی۔" اُس نے کانپتے ہوئے کہا۔

"پربھا! میری دلی خواہش تھی کہ تمہاری ایسی خوش جمال اور محبت پرست دوشیزہ میرے دل کی ملکہ بنے۔ یقین مانو! آج میں تم کو پا کر دنیا میں اپنے آپ کو سب سے خوش نصیب تصور کر رہا ہوں۔ مجھے بغیر دیکھے اور بغیر جانے پہچانے تم نے مجھ سے محبت کی۔ ایسی محبت جسے دا ملے کی برائیاں بھی متزلزل نہ کر سکیں۔ میں اور کچھ نہیں کہتا۔ میں تم سے صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس افسانے کا انجام ٹھیک رہیگا؟"

میرے افسانے کا!" اُس نے کہا۔

"میں تم سے ایک چیز مانگنا چاہتا ہوں۔"

"کیا؟"

"میں نے سینکڑوں افسانے لکھے ہیں لیکن اُن کا انجام کبھی درست ثابت نہیں ہوا لیکن اس "چود کا پریم" نامی افسانے کا انجام میں درست ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ یولو کس کے افسانے کا انجام ٹھیک رہے گا؟"

"تمہارے افسانے کا میرے دل کے چور!" کہہ کر اس نے ہنستے ہوئے اپنے افسانے کو پھاڑ کر ایک طرف پھینک دیا۔

# کھیل

رسالہ کے ایڈیٹر کا نام کنول تھا اور رسالہ کا نام "نوبہار"۔ یوں تو نوبہار کی آٹھ سالہ زندگی میں اس کی عنانِ ادارت کتنے ہی ایڈیٹروں کے ہاتھوں میں رہی لیکن کنول کی طرح کسی نے بھی نوبہار کو مُلک کے مشہور ادبی رسائل کی صفِ اول میں لانے کی کوشش نہ کی تھی۔ وہ دن رات اس کیلئے محنت کرتا تھا۔ شوخ اور جوان افسانے، دلکش غزلیں، اور بلند پایہ مضامین کی فراہمی کے لئے اُسے بے انتہا تگ و دَو کرنی پڑتی تھی لیکن وہ ہمت نہ ہارتا تھا۔

آخر اُس کی محنتیں بار آور ہوتیں۔ "نوبہار" ملک کے مشہور ادبی رسائل کی صفِ اول میں آگیا۔ دو ہی سال میں اُس نے نوبہار کے لئے چوٹی کے لکھنے والے پیدا کر لئے۔ اب اُسے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ اُس کی نگرانی میں کام کرنے والے بھی اس کے معیار کو سمجھ گئے تھے اور وہ لاہور سے باہر رہ کر بھی اُن سے حسب منشا کام لے سکتا تھا۔ چنانچہ پچھلی گرمیوں میں وہ سیر کی غرض

سے پندرہ دن کے لئے ہردوار چلا گیا۔

وہاں جب چاندنی کو گنگا کی لہروں سے کھیلتے ہوئے دیکھتا تو اُسے بھی اُن لہروں کے ساتھ کھیلنے میں بے اندازہ مسرت کا احساس ہوتا۔ لیکن کبھی کبھی جب گنگا کی سطح پر چاند کو کانپتے ہوئے دیکھتا تو وہ اس سوچ میں پڑ جاتا کہ نہ جانے کتنے چاند ہیں جو اپنے ارمانوں کے ایک بے پناہ ہجوم میں گھر کر اسی گنگا کی بیقرار موجوں میں خود کو کھو چکے ہیں ـــــ اور ایسے ہی خیالات میں اُلجھ کر وہ اکثر افسردہ ہو جاتا۔

اُس دن صبح جب سورج کی کرنیں گنگا کی لہروں سے اٹھکھیلیاں کر رہی تھیں، وہ پُل پر کھڑا دریا کا منظر دیکھ رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر کنول کے پھول گنگا کی گود میں مسکرا رہے تھے اور دور پہاڑیوں کی چوٹیوں پر کالے کالے بادل منڈلا رہے تھے۔ وہ کچھ دیر تک کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ وہاں سے چل دیا۔ کچھ دور جا کر موڑ پر جب گھوما تو ایک بچے کا ہاتھ پکڑے ہوئے ایک جوان عورت نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "پیلی بھیت ہاؤس کو کیا یہی راستہ جاتا ہے؟"

"ہاں، میرے ساتھ چلی آیئے، مجھے بھی وہیں تک جانا ہے۔"

عورت نے شک کی نظر سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی سمجھ گیا بولا۔ "اگر آپ کوئی حرج نہ سمجھیں تو میرے ساتھ چلی آیئے۔ پانی برسنے ہی والا ہے۔"

اور وہ چل پڑا۔ عورت نے کچھ سوچا اور پھر اُس کے پیچھے پیچھے ہولی

پیلی بھیت ہاؤس کے برابر والے مکان کے دروازہ کے آگے جا کر عورت رک گئی اور آہستہ سے کہا "شکریہ!"

کنول نے جیسے سنا ہی نہیں۔ چُپ چاپ سیدھا "جتندر بھون"

میں داخل ہو گیا۔ اُسے ہردوار آئے ہوئے آج پندرھواں دن تھا، وہ اُسی رات ہردوار سے واپس آگیا۔

واپسی پر "انگڑائی" کے عنوان سے اُسے ایک افسانہ ملا۔ افسانہ ایک عورت کا لکھا ہوا تھا اور "کنکھل" سے آیا تھا۔ پہلے تو اُس نے افسانہ کو سرسری نظر سے دیکھا۔ لیکن پھر اس نے غور سے پڑھا تو اس نے اپنے دل میں ایک چٹکی سی محسوس کی۔ لکھنے کا انداز قابل داد تھا۔ ایک ایک لفظ میں تیر و نشتر تھا۔

افسانہ کی مصنفہ کا نام "سورن لتا" ایک بار پڑھنے کے بعد اُس نے پھر دوبارہ پڑھا اور پھر خط پڑھنے لگا۔ خط میں لکھا تھا:۔

محترمی!

"نوبہار" کے لئے ایک افسانہ بعنوان "انگڑائی" ارسال ہے۔ اگر "نوبہار" کے معیار کے مطابق ہو تو اپنے موقر جریدہ میں جگہ دے کر ممنون فرمائیں، ورنہ جوابی لفافہ حاضر ہے۔ مندرجہ ذیل پتہ پر واپس کر دیں۔

سورن لتا

معرفت لفٹیننٹ کرنل اشوک کمار
کنکھل

کنول نے افسانہ ایک بار پھر پڑھا۔ افسانہ ہر لحاظ سے بہت خوب تھا۔ اُس نے خط لکھ دیا ــــــ

محترمہ!

افسانہ ملا۔ بہت خوب ہے۔ اس کرم فرمائی کے لئے ممنون ہوں۔ ستمبر کے شمارہ میں آپ کا افسانہ

شائع ہو رہا ہے۔

نیاز آگیں
کنول

ایک ہفتہ کے بعد سورن لتا کی طرف سے، اُسے پھر ایک افسانہ ملا۔ افسانہ کے ساتھ خط بھی تھا۔۔۔

محترمی!

خط ملا۔ آپ نے جو کچھ بھی لکھا۔ شکریہ! "ستم" بھیج رہی ہوں۔ امید ہے کہ آیندہ اشاعت میں آپ اسے شائع فرمادیں گے۔

سورن لتا

یہ پڑھ کر اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے لٹھ مار دیا ہو۔ حالانکہ اُس نے بھی اُسے بہت مختصر خط لکھا تھا لیکن اُس کے اختصار میں یہ بات نہ تھی۔ اُس نے اُس کے افسانے کی تعریف بھی کی تھی۔ کرم فرمائی کا شکریہ بھی ادا کیا تھا اور ستمبر کے پرچہ میں افسانہ کی اشاعت کا وعدہ بھی! مگر سورن لتا کے خط سے صاف ظاہر تھا کہ اُس نے اُسے جو کچھ بھی لکھا تھا، وہ اُس نے پسند نہیں کیا۔۔۔

اُس نے بڑبڑاتے ہوتے افسانہ میز کی دراز میں رکھ دیا۔

ع
اتنی جلدی ہوتے مغرور الٰہی توبہ!
کل کے ترشے ہوتے بت آج خدا بنتے ہیں

یہ لڑکی نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے۔ اتفاق سے ایک افسانہ ذرا سنبھلا ہوا لکھ لیا تو گویا میدان افسانہ نگاری کی شہسوار ہی بن بیٹھیں۔ جو کچھ

لکھا گیا تھا گویا وہ اُن کی نظر میں کچھ بھی نہ تھا۔ افسانے کی تعریف میں اگر زمین آسمان کے قلابے ملا دیے جاتے تو شاید آپ کی نوکِ قلم سے ہماری تعریف میں کچھ جملے پھوٹ پڑتے ...... اسی طرح بڑبڑاتا ہوا اپنے کمرے کے بجائے بھابی کے کمرے میں جا پہنچا۔ کوٹ اتار کر جب ٹانگنے لگا تو "ارے" کہہ کر واپس ہونا پڑا۔

اس کی بھابی دیکھ کر خاموش ہو رہیں۔ کچھ دیر بعد جا کر پوچھا۔

"آج کیا کھاؤ گے؟"

"آج!"

"ہاں!"

"آج تو بھابی کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔"

"جی" بھابی نے ذرا تعجب سے پوچھا "کیسا جی؟"

"جی بھی نہیں سمجھتیں؟ کیوں نہیں آخر ابھی دودھ پیتی بچی ہو نہ۔"

"سچ مانو، میں بالکل نہیں سمجھی۔"

"نہیں سمجھیں تو میری بلا سے۔" کنول نے غصے سے جواب دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ بھابی ہنس رہی ہیں۔

بھابی نے اُس کے غصہ کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ بولیں۔

"چلو، اچھی بات ہے۔ تین آدمیوں کا کھانا بچ جائے گا۔ جنگ کا زمانہ ہے۔"

"کیا کہا؟"

"یہی کہ تم نہ کھاؤ گے تو تمہارے بھیّا نہیں کھائیں گے اور تمہارے بھیّا نہ کھائیں گے تو ظاہر ہے کہ میں بھی کھانے سے رہی۔"

"اچھا، یہ بات ہے، تو اُن دنوں جب میں بیمار پڑا تھا تو سارا گھر

برت ہی رکھتا ہوگا، کیوں؟"۔

"اُس وقت ایسا کیوں کرتے؟ تب اور بات تھی۔"

کنول چڑ گیا، بولا۔" یہ تمہارا قصور نہیں بھابی! پھولی ہوئی روٹی پر آلو کی طرح رکھی ہوئی تمہاری ناک کا قصور ہے۔"

"اچھا ایڈیٹر صاحب، لیکن کھاؤ گے کیا؟ بازار سے لے آؤ۔"

"کیوں، نوکرانی کہاں گئی؟"

"وہ آج صبح دس دن کے لئے اپنے گاؤں چلی گئی ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ بھیا کو پرول اچھے لگتے ہیں میں وہی لے آتا ہوں میں تو کھاؤں گا نہیں۔ بس چائے پی لوں گا۔"

"تو بس چائے پی کر بھی کیا کرو گے؟ ایک گلاس ٹھنڈے پانی سے کام نہ چل جائے گا!"

کنول نے کچھ جواب نہ دیا۔ سبزی لینے بازار چلا گیا۔

---

ستمبر کا پرچہ شائع ہوا تو کنول کا تازہ افسانہ "ہرجائی" بہت پسند کیا گیا۔ اُسے کئی تعریفی خطوط موصول ہوئے۔ سورن لتا نے بھی اُسے لکھا۔۔۔

...... آپ کا افسانہ "ہرجائی" پڑھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کسی واقعہ سے متاثر ہو کر یہ افسانہ لکھا ہے، شروع سے آخر تک واقعات کا تسلسل بالکل نیچرل ہے اور کسی جگہ بھی یہ سوچنے کا موقع نہیں ملتا کہ ایسا کیوں ہوا؟ یا اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ بہر کیف آپ کا یہ افسانہ ہر لحاظ سے بہت خوب اور کامیاب ہے.....

کنول کتنے ہی دنوں سے اداس تھا۔ سورن لتا کا خط پڑھتے ہی اُسکے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی اور اُس نے خط کے جواب میں لکھا ـــــــ

...... میرے افسانہ کی تعریف میں آپ نے جو کچھ بھی لکھا، اس کے لئے شکریہ! "یادگار" بھی آپ کے دوسرے افسانوں کی طرح بہت خوب ہے۔ امید ہے آپ بخیریت ہوں گی۔

خیر اندیش ـــ کنول

خط لکھ چکنے کے بعد اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ وہ تمام دن بہت خوش رہا۔ شام کو جب وہ دفتر سے اپنے گھر پہنچا تو سنیما جانے کی سوجھ گئی۔ بھابی اور بھیّا کو کہنے کی دیر تھی وہ فوراً تیار ہو گئے۔ لیکن اب سوال یہ تھا کہ فلم کون سا دیکھا جائے۔ بھیّا نے کہا۔ "ہمراہی" بھابی بولیں۔ نہیں "رتن"۔ بھابی نے جیسے کنول کے دل کی بات چرا لی۔ کنول بولا۔ "رتن دیکھیں گے، رتن بہت اچھا فلم ہے۔"

اور تینوں "پربھات" سنیما کی طرف چل پڑے۔

رات کو جب وہ سنیما سے واپس آیا تو بھابی اور بھیّا تو اپنے اپنے کمرے میں جا کر لیٹتے ہی سو گئے لیکن کنول "ڈاک" لے کر بیٹھ گیا۔

---

اگلے ہفتہ کنول کو ایک ضروری کام سے جوالاپور جانا پڑ گیا جوالاپور سے واپسی پر دو دن کے لئے وہ ہردوار ٹھہر گیا۔

چھوٹے سے سفید پُل پر کھڑا وہ قدرت کے حسین مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ یکایک اُس کی نگاہیں گھومتی ہوئیں پُل کے دوسرے

سرے پر جا پڑیں۔ اُس نے دیکھا، وہی عورت چلی آ رہی تھی۔ جس نے کچھ عرصہ ہوا اسی مقام پر اس سے پیلی بھیت ہاؤس کا راستہ پوچھا تھا۔

پاس پہنچ کر اُس نے قدرے جھجکتے ہوتے نمستے کہا۔

نمستے کے جواب میں کنول نے بھی نمستے کہہ دیا اور پھر اپنا شبہ دور کرنے کے لئے کہ کیا واقعی یہ وہی عورت ہے۔ اُس نے پوچھا: "آپ وہی پیلی بھیت ہاؤس......"

"ہاں" عورت نے جواب دے کر سوال کیا: "اور آپ وہی جتندر بھون....؟"

"ہاں، میں وہیں ٹھہرتا ہوں۔ وہاں کے لوگوں سے میرے بہت پرانے دوستانہ مراسم ہیں۔"

"میں بھی جب ہر دوار آتی ہوں تو اُسی مکان میں ٹھہرتی ہوں۔ اُس مکان میں میرے چچا رہتے ہیں۔"

کنول اب کیا کہے؟ وہ اس سے سلسلۂ گفتگو جاری رکھنے کیلئے دل ہی دل میں کوئی موضوع سوچنے لگا۔ عورت بھی وہیں اُس کے پاس کھڑے ہو کر گنگا کی لہروں کی طرف دیکھنے لگی۔

کچھ دیر تک خاموشی سے سوچنے کے بعد عورت نے پوچھا "کیا آپ یہیں تک گھومنے آتے ہیں؟"

"ہاں" کنول نے کہہ دیا اور سوچنے لگا کہ اس کے سوال کا یہی جواب ہو سکتا ہے یا کچھ اور....."

عورت نے اپنے قدم آگے کی طرف بڑھاتے ہوتے کہا: "میں تو وہاں تک گھومنے جاتی ہوں۔"

"اچھا" اس مرتبہ بھی کنول اس سے زیادہ نہ کہہ سکا۔
"آپ کیا اس سے آگے گھومنے جاتے ہی نہیں؟"
اس مرتبہ کنول نے جواب میں قدرے طوالت سے کام لیا۔ بولا۔
"ہاں، جاتا تو نہیں ہوں، لیکن نہ جانے کی کوئی قسم بھی نہیں کھا رکھی ہے۔"
وہ بولی۔ "تو چلئے نہ آپ بھی۔"
دونوں ساتھ ساتھ چل پڑے۔
وہ کچھ دور پہنچ کر بولی۔ "بس میں یہیں تک گھومنے آتی ہوں۔"
اس سے آگے پانی ہی پانی تھا۔ کنول زیر لب مسکراتا ہوا بولا۔ "آگے تو پانی ہی پانی ہے، تو کیا پانی میں بھی کوئی گھومتا ہے؟"
"میں پانی سے نہیں ڈرتی، مجھے تیرنا آتا ہے۔"
"تیرنا مجھے بھی آتا ہے۔ میں تو پورے ایک میل تک تیر سکتا ہوں۔"
"تیر تو میں بھی سکتی ہوں۔ لیکن میری جنم پتری میں پانی میری زندگی کے لئے خطرناک لکھا ہے اس لئے میں ہمیشہ اس سے بچتی ہوں۔"
"اچھا کرتی ہیں آپ۔"
اور اس کے بعد دونوں خاموش ہو گئے۔ سوچ رہے تھے اب کیا بات کی جائے؟
"اب لوٹنا چاہیئے۔" وہ بولی۔
"ہاں" کنول نے کہہ دیا۔
دونوں چل پڑے۔ آدھے راستے تک دونوں میں سے کوئی نہ بولا۔
—— آخر کنول نے پوچھا۔ "آپ اکیلی ہی گھومنے آتی ہیں؟"
"ہاں، کیا ہمیں اکیلے نہیں گھومنا چاہیئے۔"

"نہیں، میرا یہ مطلب نہیں" کنول کچھ گھبرا سا گیا۔ "سچ پوچھئے تو سلسلۂ گفتگو شروع کرنے کے لئے مجھے یہی بات سوجھی۔ اس لئے......"

اُس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "تو تم مجھ سے باتیں کرنے کی سوچ رہے تھے؟"

"نہیں، ایسا نہیں" کنول پھر گھبرا گیا۔ "بات یہ ہے کہ چپ چاپ چلنے میں راستہ ذرا طویل ہو جاتا ہے۔ اس لئے....."

وہ مسکرا پڑی۔

کنول پھر خاموش ہو گیا۔ آگے کچھ کہنے کے لئے اُسے کوئی بات نہ سوجھی۔

---

دوسرے دن صبح وہ پھر ملا۔

"نمستے!"

"نمستے!"

"آپ کیا روزانہ اسی طرح گھومنے آتے ہیں؟"

"ہاں جب ہر دوار آتا ہوں تو زیادہ تر اسی طرف گھومنے آتا ہوں۔"

سن کر وہ کچھ دیر تک چپ رہی۔ پھر کسی قدر جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کا شبھ نام؟"

"میرا نام، میرا نام کنول ہے۔"

"کنول!" وہ کچھ ٹھٹکی۔ کچھ شرمائی۔ "تو آپ کا نام کنول ہے؟"

"ہاں، لیکن کیا اس طرح نام پوچھنے کی وجہ دریافت کر سکتا ہوں؟"

"کچھ نہیں، تو کیا آپ 'نو بہار' کے ایڈیٹر ہیں؟"

"ہاں!"

"آپ سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں 'نو بہار' باقاعدہ پڑھتی ہوں۔"

"اچھا، تم کہاں رہتی ہو؟"

"میں کنکھل رہتی ہوں۔"

"کنکھل؟" کنول نے پوچھا۔ "تمہارا نام؟"

"میرا نام؟" وہ ہنس پڑی۔ "بتا دوں؟"

"کیا کوئی حرج ہے؟"

"میرا نام سورن لتا ہے۔" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سورن لتا؟" کنول نے حیرت سے پوچھا۔ "تو تمہارا نام سورن لتا ہے؟"

"ہاں" سورن بولی۔ "لیکن آپ اس طرح کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"یوں ہی۔" کنول نے بات کا رُخ بدلتے ہوئے کہا۔ "تو تمہیں 'نو بہار' پسند ہے؟"

"ہاں، اور اب تو بہار کا ایڈیٹر بھی!" سورن نے مسکرا کر کہا۔ اور ساتھ ہی شرما گئی۔

سورن بولی۔ "آپ اتنے اچھے ہیں، میں نے آپ کے متعلق کبھی ایسا نہ سوچا تھا۔"

"اچھا، تم نے میرے بارے میں کیا سوچا تھا؟"

"میں نے سوچا تھا" سورن کہتے کہتے رک گئی۔ "سچ سچ بتا دوں؟"

"ہاں، سچ سچ ہی بتاؤ۔"

"میں نے سوچا تھا" سورن نے ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "کہ اڈیٹر صاحب کی آدھی بتیسی تو جھڑ چکی ہو گی۔"

کنول ہنس پڑا۔

"آپ ہنسیں گے تو میں اور کچھ نہ بتاؤں گی۔"

"اچھا اب نہ ہنسوں گا۔ اور بتاؤ۔"

"تو ہاں، اور میں نے یہ سوچا تھا کہ ایڈیٹر صاحب چشمہ لگاتے ہوں گے۔ منہ میں سگار دبا رہتا ہو گا۔ ہاتھ میں ایک بید....."

"اچھا، اب بس کرو۔" کنول قطع کلام کرتے ہوئے کلائی پہ بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "گاڑی چلنے میں صرف چالیس منٹ رہ گئے ہیں۔"

"اوہ" سورن کچھ افسردہ سی ہو گئی۔ "تو کیا آپ اسی گاڑی سے واپس جا رہے ہیں؟"

"ہاں، آج میری چھٹی کا آخری دن ہے۔ کل مجھے دفتر میں ضرور حاضر ہونا ہے۔"

"اچھا" سورن چپ ہو گئی۔

---

کنول جب سے ہردوار سے لوٹ کر آیا۔ اُسی وقت سے اُس کی بھابی اُس میں ایک عجیب تغیر سا محسوس کر رہی تھیں۔ وہ ہر وقت بہت خوش رہتا تھا۔ کوئی جھگڑے کی بات بھی ہو تو ہنسی میں ٹال دیتا۔

بھابی حیران تھیں کہ آخر کیا بات ہے۔ کنول ہر وقت ہنستا، مسکراتا رہتا ہے۔ اب اُسے اس بات کی بھی ضرورت نہیں رہی کہ بھابی آج دوپہر سے اس سے نہیں بولیں تو کیوں نہیں بولیں؟"

بھابی نے اس راز کو معلوم کرنے کی لاکھ کوشش کی، کنول سے کتنے ہی ہیر پھیر سے باتیں کیں لیکن راز، راز ہی رہا۔

اسی طرح تین مہینے گذر گئے۔ جب بھابی کو کسی طرح یہ راز معلوم نہ ہو سکا تو انہوں نے پھر ایک اور طریقہ اختیار کیا۔

شام کو جب کنول دفتر سے واپس آیا تو بھابی نے کہا "کنول، کان کھول کر سن لو، مجھ سے تو اب اس گھر میں نہ رہا جائے گا۔"

کنول حیرت سے بھابی کا منہ تکنے لگا۔ ایسی کیا بات ہوئی؟ صبح دس بجے جب وہ دفتر گیا تھا، بھابی اچھی بھلی تھیں۔ اُن کی ناراضگی کا سبب معلوم کرنے کی غرض سے وہ ذرا اداس لہجے میں بولا "اچھی بات بھابی، لاؤ بستر و ستر باندھ دوں تمہارا! لیکن بات کیا ہوئی؟"

سنتے ہی بھابی کو ہنسی آ گئی لیکن انہوں نے بہت مشکل سے ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا "بات کیا ہوئی۔ تم دونوں بھائیوں نے مل کر ناک میں دم کر رکھا ہے میرا!"

کنول حیرت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے بھابی کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ بھیا کے خلاف بھابی نے کبھی ہنسی میں بھی ایسی بات نہ کہی تھی۔ لیکن آج انہیں ایسا کہنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ ہو نہ ہو آج بھیا اور بھابی میں ضرور کچھ کھٹ پٹ ہوئی ہوگی۔

کنول نے ہنسنے کی کوشش کی لیکن صرف مسکرا کر رہ گیا "لیکن یہ تو تمہیں بتانا ہوگا بھابی، کہ ہمارا قصور کیا ہے؟"

"تم تو جیسے کچھ جانتے ہی نہیں ہو۔" بھابی پھر ہنسی کو دباتے ہوئے غصے ہی سے بولیں "انہوں نے میری ناک میں دم کر رکھا ہے کہ تم نے کچھ کہا ہی نہیں اس سے، اور تم سے جب کہتی ہوں تو تم ہنسی میں ٹال دیتے ہو۔"

کنول فوراً ہی سمجھ گیا۔ کہیں بھابی باتوں باتوں میں شادی کے بارے

میں میرا دل تو نہیں ٹٹول رہی ہیں۔ لیکن جیسے کچھ سمجھا ہی نہیں بولا: "لیکن بھابی، تمہاری بات میں لے کب ٹالی ہے؟"

بھابی ذرا مسکرائیں اور کنول کو اپنے دام میں اُلجھتے ہوئے دیکھ کر بولیں: "اچھا تو پھر بتاؤ کیا کہتے ہو؟"

کنول سمجھ گیا۔ بولا: "پھر کسی اور وقت بتاؤں گا۔" اور ہنستا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

---

صبح جب چائے لے کر بھابی کنول کے کمرے میں گئیں تو کنول کمرے میں موجود نہ تھا۔ ہاتھ منہ دھونے غسلخانے میں گیا ہوا تھا۔ بھابی نے چائے کا گلاس میز پر رکھ دیا اور کمرے کی چیزوں کا جائزہ لینے لگیں۔

کنول کل شام کو جب دفتر سے آیا تھا تو اُس کے ہاتھ میں ایک کتاب اور تین چار خط تھے۔ بھابی نے پہلے کتاب اٹھائی۔ نام دیکھا اور پھر لفافے اٹھا اٹھا کر پتے پڑھنے لگیں۔ ایک لفافے کے کونے پر بھیجنے والے کا نام لکھا تھا: "سورن لتا"

بھابی نے ایک بار کمرے کے باہر جھانک کر دیکھا اور پھر خط پڑھنے لگیں۔

کنول!

میں اپنے خیالات کے سہارے اب تک جس
مقام پر پہنچی ہوں وہاں سے اب واپس ہونا میرے
لئے بہت مشکل ہے۔
تم نے جو مجھے روشنی دکھائی ہے۔ اُس روشنی

ہیں، میں یقیناً منزل مقصود تک پہنچنے میں کامیاب ہونگی۔
چار مہینے گذر گئے۔ لیکن تم پھر ہردوار نہیں آئے۔
کیا اب تم ہردوار نہیں آؤ گے؟ پُور نماشی کے موقعہ
پر آنا ضرور، ضرور،

تمہاری ــــ سودن لتا

پڑھ کر بھابی نے خط تہہ کر کے جلدی سے لفافے میں رکھ دیا اور چائے کا گلاس اٹھا کر رسوئی میں واپس آگئیں۔ چائے کا گلاس آگ پر رکھ کر انہوں نے کنول کو پکارا۔

کنول ہاتھ منہ دھو کر غسلخانہ سے نکلا "کیا ہے بھابی؟"

"چائے تیار ہے۔"

"اچھی بات ہے۔"

اور بھابی چائے کا گلاس لے کر جب کمرے میں پہنچیں تو میز پر صرف کتاب پڑی تھی۔ خطوط نہیں تھے۔

چائے دے کر بھابی نے کہا "اب ایسے کام نہیں چلے گا یا تو تم اپنے پسند کی کوئی لڑکی بتاؤ۔ نہیں تو ہم پھر کوئی لڑکی پسند کریں۔"

"دیکھو تو بھابی" کنول نے چائے کا ایک گھونٹ لے کر حلق سے نیچے اتارتے ہوئے کہا۔ "میں کل جا رہا ہوں ہردوار، وہاں سے واپسی پر بتاؤں گا۔"

"کیوں؟" بھابی نے پوچھا "وہاں سے واپسی پر کیوں بتاؤ گے؟ وہاں کیا کوئی لڑکی پسند کرنے جا رہے ہو؟"

"اوہ بھابی" کنول نے ذرا پریشان ہو کر کہا۔ "تم تو بس ....... خیر وہاں سے واپسی پر بتاؤں گا۔"

"اچھی بات ہے۔ لیکن واپسی پر تمہیں اس بات کا ضرور فیصلہ
کرنا ہوگا۔"

---

اُسی چھوٹے سے سفید پل پر سورن لتا ملی۔ ملتے ہی بولی: "مجھے
یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔"
"اچھا" کنول مسکرایا۔ "لیکن تمہیں اس کا یقین کیسے ہوگیا تھا؟"
"اپنے دل سے پوچھو۔"
"ہاں" کنول اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا "ایسی باتیں جاننے کے
قابل تو ہوگئی ہو تم"
"اور تم بھی تو" سورن کی آنکھوں میں خمار سا آگیا۔
کنول اس کی آنکھوں کے خمار میں خود کو جذب کرتا ہوا بولا "ایک
بات پوچھوں؟"
"پوچھ لو۔"
"تم مجھے اتنی اچھی کیوں لگتی ہو؟"
"یہ تم اپنی آنکھوں سے پوچھو۔"
"یہ آنکھیں، شاید میرے سوال کا جواب نہ دے سکیں۔"
"دل سے پوچھ لو۔"
"دل ـــــ دل ہے کس کے پاس؟"
"تو بیدل ہیں آپ؟" سورن مسکرائی۔
"ہاں، دل تو دل والوں کے پاس پہنچ گیا، اب تو اس کی جگہ حسرت
وارمان نے لے رکھی ہے۔"

"وہ دل والے آخر ہیں کون ؟"

"چھوڑو، کیا کرو گی پوچھ کر ؟"

"بتاؤ بھی، تمہیں میری قسم ۔"

"بتا دوں، برا تو نہ مانو گی ۔"

"اس میں برا ماننے کی کونسی بات ہے ؟"

"بس سمجھ جاؤ ۔"

سورن سمجھ گئی۔ لیکن پھر بھی انجان بن کر بولی ۔ "تمہاری یہ پہیلی تو میری سمجھ سے بالا ہے، تمہیں سمجھا دو ۔"

"اگر میں کہہ دوں کہ تمہیں ہو وہ، تو برا تو نہ مانو گی ؟" کنول نے دل کی بات کہہ دی ۔ "سورن میں نے جب سے تمہیں دیکھا ہے یقین مانو تمہارا ہو گیا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ تم میرے ساتھ رہو اور میری زندگی کو اپنی حسین مسکراہٹوں کے پھولوں سے مہکا دو ۔"

"میں" سورن کہتے کہتے رک گئی۔ نگاہیں نیچی کر کے شرمیلے انداز سے بولی "کیا ہمارا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے ؟"

"کیوں نہیں، میرے بھیا اور بھابی تو خوشی کے مارے پھولے نہ سمائیں گے ۔"

"میرے والدین بھی یقیناً اس رشتہ کو پسند کریں گے ۔"

"سچ ؟" کنول کو جیسے قاروں کا خزانہ مل گیا ہو۔

---

گھر واپس آکر کنول نے سورن لتا کو خط لکھا کہ میں نے بھیا اور بھابی کو رضامند کر لیا ہے۔ جواب میں سورن نے لکھا۔

کنول!

تم نے اپنے ایک افسانے میں لکھا ہے
عورت کی آنکھ میں ایک ایسا جادو ہے کہ یہ پہلی ہی نظر میں مرد کے دل کو اپنا لیتی ہے۔ لیکن اس کے نزدیک یہ فعل "کھیل" سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

اب تک میں تمہارے اس خیال کو عورت ذات پر ایک بے حقیقت الزام سمجھتی تھی۔ لیکن حالات مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں تمہارے خیال کی صداقت کا زندہ ثبوت بنوں۔ میری زندگی کے کھیل کی یہ عجیب جیت ہے کہ میں جیت کر بھی ہار رہی ہوں اور اس جیت کی یاد رہتے دم تک میری آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی پروتی رہے گی اور میں انہیں حسرت سے اپنے آنچل میں چھپا لیا کروں گی! دُنیا میں میری ناکامی کو کامیابی کہہ کر مجھ سے اظہارِ ہمدردی کرنے کے بجائے مجھے مبارکباد دے گی۔ میرا دل روتا رہے گا۔ میں مسکراتی رہوں گی......

کل میری شادی ایک اجنبی نوجوان سے ہو رہی ہے۔

سورن لتا

# عورت پھر عورت ہوتی ہے

وہ تھکا تھکا سا صوفہ پر پڑا سگریٹ پھونک رہا تھا اور سوچ رہا تھا رات کی باتیں! سوچ رہا تھا، کون تھی وہ لڑکی؟ نام کتنا پیارا ہے۔ کسم! اُسکا بھائی اتنی بھیڑ میں اور پھر اتنی رات گئے اسے اس طرح اکیلا چھوڑ کر گھر چلا گیا؟ اگر کوئی اُسے بہکا کر کہیں لے جاتا تو؟ وہ تو لڑکی کی قسمت اچھی تھی کہ میں نے اُسے دیکھ لیا اور گھر چھوڑ آیا، لیکن..... لیکن اُس نے مجھ سے یہ کیوں کہا کہ "اوپر چلو؟" دو بجے ہوں گے اُس وقت، ایسے وقت میں اوپر جاکر کیا کرنا؟ اور اُس کے گھر کے لوگ؟..... کیسی تھی وہ لڑکی؟.....

"کامیشور!"

"کیا ہے ماں؟" کامیشور سگریٹ ایک طرف پھینک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کئی دن سے لتا کی کوئی خبر نہیں ملی۔ تو بھی اُسے دیکھنے نہیں گیا۔ اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا ہے، یہ کیا اچھی بات ہے کامیشور؟"

نادم سا ہو کر بولا "آج ضرور جاؤں گا ماں!"

قدرے فکر مند لہجے میں وہ بولیں: "اس سال تم دونوں کے بیاہ کی بات سوچ رہی تھی لیکن لتا کی بیماری نے...... کیسی پیلی ہو گئی ہے۔ نہ جانے لڑکی کو کیا ہوتا جا رہا ہے؟ اچھا اُس جرمن ڈاکٹر نے کیا بتایا ہے؟"

"وہی، جو پہلے ڈاکٹروں نے بتایا تھا۔ دل ٹھیک ہے پھیپھڑے ٹھیک ہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہے، کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ صرف خوش رہنے سے طبیعت بشاش ہو سکتی ہے، لیکن تمہاری لتا تو بس...... سیدھی بات بھی اس سے کہو تو وہ اُلٹا ہی مطلب لیتی ہے، ہر وقت دل ہی دل میں کڑھتی ہے۔ اسی لئے تو میں اب وہاں زیادہ آنا جانا نہیں۔"

"نہیں بیٹا! تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ بیماری کی حالت میں اُسکے پاس نہ جانا بری بات ہے! اچھا تو اب کب جاتے گا؟"

"شام کو چائے کے بعد۔"

ماں چلی گئی۔

کاملیشور نے سگریٹ سُلگایا اور کمرے میں ٹہلتے ہوئے سوچنے لگا۔ ـــــ لتا سے مجھے کس قدر محبت ہے، میں اُسے کتنا چاہتا ہوں، یہ میرا دل ہی جانتا ہے مگر اُسے مجھ پر ذرا بھی اعتماد نہیں۔ میری محبت کو شاید فریب سمجھتی ہے۔ تبھی تو بات بات پر نکتہ چینی کرتی ہے۔ جس پر غصہ آجاتا ہے اور منہ سے ایسی بات نکل جاتی ہے جسے سنتے ہی شاید وہ اپنے دل پر چوٹ سی محسوس کرتی ہے۔ لوگ جب اُس سے یہ شکایت کرتے ہیں کہ میں اِدھر اُدھر گھومتا ہوں تو وہ فکر مند ہو جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں، یہ سب محض دلوں میں نفرت پیدا کرنے والی باتیں ہیں۔ لتا! میں صرف دنیا کو سمجھنا چاہتا ہوں جب تم میرے گھر آجاؤ گی تو یقین رکھو تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہ ہو گا۔ مگر وہ یقین

کب کرنی ہے؟ اُس دن چڑ کر اپنے کاکا سے کہہ دیا تھا ابھی وہ شادی نہیں کرے گی۔ کیوں؟ اسی لئے کہ میں نے اپنی ایک بھی بُرائی اُس سے پوشیدہ نہیں رکھی۔ صاف طور پہ بتادیا کہ مجھ میں یہ برائیاں ہیں! واہ ری دنیا!

---

"آج کیسی طبیعت ہے لتا؟"

"روز کی طرح اچھی ہوں! آج یہاں آنے کی آپ کو فرصت کیسے مل گئی؟"

وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ "فرصت؟ تمہارے لئے تو میں ہر وقت فرصت میں رہتا ہوں لتا؟.... لیکن اُس دن تمہیں نے تو کہا تھا کہ روز روز مت آیا کرو۔"

"ٹھیک کہا تھا۔ ایسی لُو میں ٹھیک بارہ ایک بجے شہر سے کنتال پارک تک آنا۔ لُو لگ جانے بس..... پھر ہزار بار کاکا نے کہا، شام کو سورج غروب ہونے کے بعد چلے جانا، لیکن آپ کی زندگی کیا اتنی سستی ہے کہ کنتال پارک میں بسر کی جائے۔ اُسی وقت لوٹنا!.... اسی لئے روز روز آنیکو...."

اُس نے قطع کلام کیا: "دیکھو لتا لڑو جھگڑو مت! نہ جانے کتنی آرزوئیں لے کر تمہارے پاس آتا ہوں، پر تمہارا خشک برتاؤ دل توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ یہ اچھی بات ہے؟"

لتا ہنس پڑی بولی: "کیا سچ مچ میں قصوروار ہوں۔ اور آپ کی باتیں؟"

کاملیشور نے پھر قطع کلام کرتے ہوئے کہا: "یہ میں کب کہتا ہوں کہ میں نیک ہوں، مجھ میں ایک بھی خوبی نہیں ہے۔ میں بُرا ہوں اور بہت بُرا لیکن لتا، اِس کے ساتھ ہی میں یہ بھی تو یقین دلاتا ہوں کہ جب تم میرے

گھر آؤ گی تو ہر کام تمہاری مرضی کے مطابق ہوگا۔ تم جو چاہو گی وہی ہوگا۔ لیکن نہ جانے کیوں تمہیں میری باتوں پر یقین نہیں ہوتا۔ تم نے اُس دن اپنے کاکا سے بھی کہہ دیا کہ "ابھی شادی نہیں کروں گی!" اِن چڑانے والی باتوں سے آخر کیا حاصل ہوگا لتا؟"

لتا ترش لہجہ میں بولی "حاصل کیا ہوگا' یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں! آپ ضدی ہیں' کریں گے وہی جو دل میں ہوگی۔ اسی لئے میں نے سوچا کہ پہلے آپ خواہشات کی آگ سے جلتے ہوئے دل کو اچھی طرح ٹھنڈا کر لیں۔ بیاہ تو پھر بھی ہو سکتا ہے۔"

غصّے سے کامیشور کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ خون کے سے گھونٹ پی کر رہ گیا آخر کر ہی کیا سکتا تھا۔ آہستہ سے بولا "جیسے تمہاری مرضی!"

جمنا سامنے کی میز پر چائے کی ٹرے رکھ کر باہر چلی گئی۔ کامیشور نے لتا کے لئے چائے کی پیالی بنا کر اُس کی طرف کھسکا دی اور اُس کے لئے "ٹوسٹ" پر مکھن لگانے لگا۔

لتا نے کہا "تو کیا آپ چائے نہیں پئیں گے؟"

ٹوسٹ کی پلیٹ اُس کے اسٹول پہ رکھتے ہوئے اُس نے کہا "نہیں! میں پی آکر آیا ہوں۔"

لتا اُس کے متعلق یہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ دن میں کئی بار چائے پینے کا عادی ہے۔ اس وقت وہ ناراض ہو گیا ہے۔ ذرا اور کہنے سے وہ پی لے گا۔ لیکن اس کے باوجود لتا نے اُس سے کچھ نہیں کہا۔ سوچا روز روز کے روٹھنے والے کو کہاں تک منایا جائے؟ ہمیشہ اپنے دل کی سی کرتے ہیں مجھے ضرورت کیا ہے؟ اور وہ چپ چاپ چائے پیتی رہی۔

لیکن لتا کی اس خاموشی نے کامیشور کے دل میں ایک گہری چٹکی لی۔ وہ ایک سگریٹ سلگا کر چپ چاپ دھواں اڑانے لگا۔

دونوں دل ہی دل میں سوچ رہے تھے۔ کیا ہم دونوں شادی کے بعد خوشگوار زندگی بسر کر سکیں گے؟ دونوں کی طبیعتوں میں بہت زیادہ اختلاف ہے دونوں سے کوئی بات برداشت نہیں ہو سکتی۔ ایک لمحہ ہنسنے کے بعد ہی جھگڑے کی نوبت آجاتی ہے۔ ایسی حالت میں عمر بھر کے لئے ایک ہو جانا کسی صورت بھی بہتر ثابت نہ ہوگا۔

اُس دن وہ دل پر ایک بوجھ سا لئے ہوئے گھر واپس آیا۔۔۔۔ لتا بھی اپنی عادت سے نالاں تھی۔ یہ سب کیا ہو جاتا ہے؟ جن کی طرف ہمیشہ میری آنکھیں لگی رہتی ہیں، ان کے آنے پر میں ایسی باتیں کیوں کرنے لگتی ہوں؟ یہ کیسا میرا برتاؤ ہے؟"

---

رات کو جب ساڑھے بارہ بجے کے قریب کامیشور سینما ہال سے باہر نکلا تو کسم آج بھی اُسی جگہ چپ چاپ کھڑی سینما ہال سے نکلتے ہوئے تماشائیوں کو دیکھ رہی تھی۔ دیکھتے ہی اُسے حیرت ہوئی یہ کون ہے؟ آدھی رات کو آج اسے دوسری بار یہاں کھڑی دیکھ رہا ہوں!۔۔۔۔۔ وہ معلوم ہوتا ہے یہ لڑکی شکار کی تلاش میں ہے تو پھر آج اور۔۔۔۔۔ اُس کے پاس جاکر اُس نے پوچھا "کیوں کیا بات ہے کسم؟ یہاں کیسے کھڑی ہو؟ کیا آج پھر تمہارا بھائی تمہیں یہاں اکیلا چھوڑ گیا ہے؟"

کسم نے ذرا شرماتے ہوئے کہا "جی نہیں، آج تو میں اکیلی ہی پکچر دیکھنے چلی آئی تھی۔"

تو آؤ بیٹھو، میری کار میں! تمہیں تمہارے گھر چھوڑتا جاؤں گا۔"
کسُم بلا جھجک کاملیشور کے ساتھ جا بیٹھی۔ کاملیشور نے ایک بار اُس کے چہرے پر نظر ڈالی اور پھر اُس کی کار کی رفتار پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی۔ کسُم نے ایک بار بھی تو نہیں کہا کہ "آپ ادھر کہاں جا رہے ہیں؟ میرے گھر کا راستہ تو ادھر ہے؟"
راوی کے اُس پار بارہ دری کے پاس ہی آ کر اُس کی کار رُک گئی اور کار سے نیچے اتر کر بولا۔ "آؤ تھوڑی دیر یہاں ٹہلیں کسُم!"
"لیکن اس وقت رات کے دو بج رہے ہوں گے۔"
"ارے نہیں مشکل سے ایک بجا ہو گا! آؤ تھوڑی دیر میں واپس چلتے ہیں۔"
بارہ دری میں ٹہلتے ٹہلتے اُس نے سب کچھ بتا دیا کہ وہ کس کی بیٹی ہے اور کون اُس کے ماں باپ ہیں، یہ وہ کچھ بھی نہیں جانتی۔ آج تک جس بڑھیا کو وہ اپنی دادی سمجھتی رہی ہے، ایک مہینہ ہوا اُس نے بتایا کہ کس کام کے لئے اُس نے اُس کی پرورش کی ہے، اور روزانہ وہ اُسے سجا بنا کر اس طرح اکیلی اِدھر اُدھر بھیج دیتی ہے۔ وہ انکار کرتی ہے تو اُسے جھاڑو اور دستے پنے سے پیٹتی ہے۔
کاملیشور نے ایک لمبا سانس لیا۔ اُس نے پوچھا۔ "تم اس زندگی سے خوش ہو کسُم؟"
کسُم کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اُس نے سر ہلاتے ہوئے کہا:
"یہ بھی کوئی زندگی ہے کاملیشور بابو! اس جینے سے مر جانا بہتر ہے۔ آج تک میری جس سے بھی ملاقات ہوئی۔ میں نے اُس سے یہی سوال کیا کہ کیا

ہمیشہ کے لئے تم مجھے اپنی داسی نہیں بنا سکتے؟ لیکن کوئی..... آپ بھی تو ابھی کہہ رہے تھے کہ تم بہت خوبصورت ہو کسم! میں آپ کو بہت اچھی لگ رہی ہوں، بولئے، کامیشور بابو، کیا آپ مجھے اپنی داسی بنا سکتے ہیں؟"

کامیشور کا چہرہ اتر سا گیا، کانپتے ہوئے لہجہ میں بولا "کسم! میں تم سے بیاہ کر لیتا لیکن لتا..... میں لتا کا ہو چکا ہوں۔ اتنا کر سکتا ہوں۔ اگر سچ مچ تمہیں اس زندگی سے نفرت ہے تو اسے چھوڑ دو۔ تمہارے گھر کا خرچ میں دوں گا۔ یہ تو راضی ہو؟"

"ہاں، اتنا ہی میری زندگی کے لئے بہت کچھ ہے کامیشور بابو! بیاہ نہ کرنے پر بھی عمر بھر آپ کی داسی بن کر رہوں گی اور ان چرنوں کی پوجا کرتی رہوں گی۔"

اس کے بعد دونوں واپس آ گئے۔ کسم نے اس رات کامیشور کو اپنے ہی یہاں روک لیا۔ صبح اٹھ کر جب وہ اپنے گھر آنے لگا تو چپ چاپ اس کے سرہانے پانچ سو کے نوٹ رکھ آیا۔

کسم کی دادی جب اپنے کمرے سے باہر نکلی تو اس نے دیکھا سیڑھیوں کا دروازہ کھلا پڑا ہے۔ وہ وہیں سے چلائی "اری او کسم! رات دروازہ بند نہیں کیا تھا، ڈائن، ناک میں دم کر رکھا ہے۔ گھر کو برباد کرنے پر تلی ہے چڑیل! باہر گھوم پھر کر عیش کرتی ہے، لیکن گھر ایک پیسہ بھی نہیں لاتی! کہاں مر رہی ہے تو؟ ابھی تک رانی جی سوتی ہوں گی! اری اٹھ!"

اور وہ اسی طرح بکتی جھکتی کسم کے کمرے میں داخل ہوئی۔ کسم اٹھ کر ٹانگیں لٹکائے، مسہری پر بیٹھی آنکھیں مل رہی تھی۔ بڑھیا کی نظر اس کے سرہانے رکھے ہوئے نوٹوں پر پڑ گئی۔ ایک پل میں سارا غصہ کافور ہو گیا۔ اندر ہی اندر

اُس کا دل خوشی کے مارے جھوم اٹھا۔ نوٹ گن کر بولی۔ "اوہ، پانچسو روپے! سو جا بیٹی، ابھی آنکھوں میں نیند باقی ہے! سو جا۔ لے چادر میں اڑھا دیتی ہوں شام کو پھر جانا ہوگا۔"

کسم نے خشک لہجہ میں کہا۔ "شام کو کہیں اِدھر اُدھر نہ جانا پڑے، اسی لئے تو وہ پانچسو روپے دے گئے ہیں۔"

"اچھا اچھا، یہ بات ہے! تب تو ٹھیک ہے، چائے پیئے گی" بولا دیا۔ اور باورچی خانہ کی طرف چلی گئی۔

کسم نے اپنے دل میں چبھن اور نفرت سی محسوس کی۔ اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔

---

ایک مہینہ گذر گیا۔ لیکن پھر کبھی کاملیشور کسم کے یہاں نہ آیا۔ وہ دن رات اُس کی راہ تکتی۔ سوچتی۔ کیا میں اُن کے گھر جاؤں؟ لیکن اُن کی ماں کیا کہیں گی؟ اور اگر کہیں لتا کو معلوم ہو گیا تو وہ پھر اُن کا منہ نہ دیکھے گی۔ تو پھر؟ ........ وہ مجھے بھول گئے؟ مہینہ پورا ہو گیا۔ بڑھیا اِدھر اُدھر بھیجنا چاہتی ہے۔ ہائے میں کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟ کاملیشور بابو! داسی کو بھول کیسے گئے؟......

---

"تم کون ہو بیٹی؟"

"میں .... میں ایک غریب دکھیاری ہوں ماں! نوکری کی تلاش میں ہوں۔ اگر آپ اپنی سیوا کے لئے ......"

"ہوں! میرا بچہ کاملیشور ایک مہینہ سے بیمار ہے۔ تم پڑھی لکھی معلوم

ہوتی ہو، اچھا تم کل آنا ہیں تمہیں ...... ڈاکٹر نرس رکھنے کو بھی کہتا تھا۔ کیا ہوگا نرس کا؟ تم اس کی دیکھ بھال کر سکو گی نا؟"

"ہاں ہاں، جیسے آپ کہیں گی ویسے ہی کروں گی...... اس وقت رات کو میں کہاں جاؤں؟"

"اچھا یہیں رہو..... چندا جا اسے باورچی خانہ کے پاس والی کوٹھری رہنے کے لئے دکھا دے۔"

ایک پل کے لئے بھی اُس کی پلک نہیں جھپکی۔ وہ تمام رات جاگتی رہی وہ ایک مہینے سے بیمار ہیں اور میں بد قسمت سمجھ رہی تھی کہ وہ مجھے بھول گئے ہیں۔ آہ! اسی طرح عمر بھر اس کوٹھری میں اگر مجھے پڑا رہنے دیں......

---

"دوا پی لیجئے!"

کامیشور چونک اٹھا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا ــــ سامنے کسم دوا کی پیالی لئے کھڑی تھی۔ حیرت سے بولا "تم!..... کسم! تم یہاں! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔"

اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ بولی "تو کیا کرتی؟ اب میں وہاں نہیں رہ سکتی وہ بڑھیا مجھے پھر....."

"تو.... تم مہینے کے روپے لینے آئی ہو؟"

کسم اس چوٹ کو برداشت نہیں کر سکی۔

کامیشور نے دوا پی کر کہا "میں تمہیں روپے دیدوں گا! تم گھر جاؤ، کسم!"

وہ اُلٹے قدم لوٹ آئی۔ میں صرف مہینے کے روپے مانگنے آئی تھی۔

یہی سمجھے ہیں میرے دیوتا! آہ! ایک رسوا عورت کی محبت پر انھیں کیونکر اعتبار ہو سکتا ہے؟ اور وہ اپنی چارپائی پر تکیے میں منھ دے کر رونے لگی۔

چندا نے آکر کہا "تمہیں مالکن بلا رہی ہیں۔"

وہ آنسو پونچھ کر اُن کے پاس پہنچی تو انہوں نے اُس کے اترے ہوئے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "دوا پلا دی بیٹی؟"

"ہاں ماں! لیکن..... لیکن وہ مجھے رکھنا نہیں چاہتے۔ انھوں نے کہا تمہاری ضرورت نہیں، تم جاؤ!"

ماں مسکراتے ہوئے بولیں "اور تو گھبرا کر رونے بیٹھ گئی۔ پگلی! جا رسوئی گھر میں، اُس کے لئے ساگودانہ اور چلتے بنوا لا۔ میں اُسے سمجھا دونگی۔"

---

چندا کامیشور کے کمرے میں، میز پر پھولوں کا گلدستہ رکھ کر کمرے سے باہر جانے کے لئے دروازے کی طرف بڑھی تو کامیشور نے پوچھا "وہ لڑکی کیا چلی گئی۔ چندا؟"

"ہاں مالک! ابھی ابھی ماں سے کہہ رہی تھی۔ میں جاتی ہوں۔ بابو مجھے رکھنا نہیں چاہتے۔"

"تو کیا ماں نے اُسے نوکر رکھا؟"

"جی ہاں، آپ کی خدمت کے لئے، رات ہی تو آئی ہے بیچاری۔"

"اوہ! تو میں نے غلطی کی۔"

چندا چلی گئی۔

کامیشور سوچنے لگا۔ وہ تو روپے لینے نہیں آئی تھی، وہ یہاں رہنے آئی تھی، نوکرانی بن کر۔ کسُم کو واقعی اُس جہنمی زندگی سے نفرت ہے۔ نہیں تو

وہ یہاں آکر نوکری کیوں کرتی ؟ اور میں نے اُسے مایوس کر کے پھر اُسی جہنم میں دھکیل دیا۔

عین اسی وقت چندا نے کمرے میں داخل ہوکر کہا "ماں پوچھ رہی ہیں آپ چائے پئیں گے ؟"

"ہاں !"

"اس لڑکی کو ماں نے نہیں جانے دیا مالک !"

"اچھا !..... تو اچھا کیا" اور اُس نے ایک اطمینان کا سانس لیا۔

---

"کاکا کیا آپ شہر جا رہے ہیں ؟"

"ہاں بیٹی، کامیشور کو دیکھنے جا رہا ہوں۔"

"میں بھی چلوں، کاکا..... ؟"

"کیا ہرج ہے !"

اور کاکا کے ساتھ لتا شہر آئی۔ کامیشور کی ماں اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ کسُم اُس وقت رسوئی گھر میں بیٹھی کامیشور کے لئے ساگودانہ پکا رہی تھی۔ اُس نے سنا لتا دیوی آئی ہیں۔ اُس کا ننھا سا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔

ماں کے پاس سے اُٹھ کر لتا کامیشور کے کمرے میں داخل ہوئی۔ تو کامیشور نے اُسے دیکھتے ہی مسکرا کر کہا "آؤ لتا ! اب تو جی اچھا ہے تمہارا ؟"

لتا اُس کے سرہانے پلنگ پر بیٹھ گئی اور غمگین لہجہ میں بولی "ایک ہی مہینہ میں یہ کیسی حالت ہو گئی ہے تمہاری ؟"

"فکر مت کرو !..... اب تو ٹھیک ہے طبیعت ....."

ماں نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ ابھی تک کاملیشور کو ساگودانہ نہیں دیا کسم نے، وہ رسوئی گھر میں جا کر بولیں: "یہ کیا کسم؟ یہاں گم سم بیٹھی کیا سوچ رہی ہو؟ ساگودانہ تیار ہو گیا ہے تو جلدی سے لے جاؤ۔"

کانپتے ہوئے قدموں سے کسم کمرے میں داخل ہوئی۔ لتا، کاملیشور کی پیشانی پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیر رہی تھی اور کاملیشور ہنس رہا تھا۔ کسم کو دیکھ کر لتا کچھ شرما گئی۔ اُس نے اپنا ہاتھ کاملیشور کی پیشانی سے ہٹا لیا اور اُس کے پاس سے اُٹھ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

کاملیشور ساگودانہ کھانے لگا۔ لتا نے کسم کی طرف دیکھا۔ کسم کی خوبصورتی و رعنائی ایسی نہ تھی کہ کوئی اُسے ایک بار دیکھے اور پھر نہ دیکھے۔ لتا دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

خالی برتن لے کر کسم چلی گئی۔

"یہ کون تھی؟ نوکرانی تو دکھائی نہیں دیتی۔ کیا کوئی رشتہ دار ہے؟"

"نہیں، بے چاری غریب بے یار و مددگار ہے۔ ابھی کچھ دن ہوئے ماں نے نوکر رکھا ہے۔"

"اوہ! میں سمجھی آپ نے اسے رکھا ہے! کتنی خوبصورت ہے یہ!"

کاملیشور نے لتا کو ترچھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا: "مگر تم سے زیادہ حسین نہیں ہے۔ لتا کاملیشور کتنا ہی برا کیوں نہ ہو، لیکن جسے اُس کے گھر کی دیواروں نے سہارا دیا ہے، اُس سے اُس کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔"

"لتا نے نادم ہو کر آنکھیں جھکا لیں۔

کسم نے کمرے میں آ کر لتا سے کہا: "آپ کو ماں بلا رہی ہیں۔"

"اچھا ابھی چلتی ہوں۔" لتا نے کاملیشور کو اجازت طلب نگاہوں سے

دیکھا اور کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا پھر آؤ گی نا؟"

"ضرور آؤں گی۔"

زینے سے اُترتے اُترتے لتا نے کسُم سے پوچھا۔" یہاں تمہارا جی تو لگ گیا ہو گا؟"

کسُم چونک اٹھی۔ کیا جواب دیتی جھجکتے ہوتے بولی:"جی اگر نہ بھی لگے تو اور کوئی رہنے کی جگہ ہی کہاں ہے، رانی؟"

"بڑی اچھی ہو تم! اچھا کسم اپنے مالک کے اچھے ہو جانے پر اُن کے ساتھ ایک بار میرے گھر آنا۔ پھر ہوں گی باتیں۔ آؤ گی؟"

"ضرور آؤں گی۔"

زینے سے اتر کر جب لتا صحن میں آئی تو کاکا جانے کے لئے تیار کھڑے تھے لتا ماں کو نمستے کہہ کر دعائیں لیتی ہوئی کاکا کے ساتھ ہولی۔

کسم سوچنے لگی ـــــ تم ایک خوش قسمت لڑکی ہو، بدقسمت کسم پر اتنی محبت اور مہربانی نہ کرو۔ آہ! لتا نہیں جانتی کہ میں اُس کے سوامی کو ہی اپنا دیوتا سمجھے بیٹھی ہوں۔ لیکن نہیں مجھے اس گھر سے جانا ہی ہو گا۔ اسی میں کاملیشور بابو کا فائدہ ہے۔

---

کسم کو یہاں رہتے ہوتے ایک سال ہو گیا۔ اس عرصہ میں کاملیشور اور لتا کی شادی ہو گئی۔ لتا جو چاہتی وہی ہوتا۔ اُس کی مرضی کے خلاف قدم اٹھانے کی کسی میں بھی جرأت نہ تھی۔ کاملیشور بابو اُس کے اشاروں پر چلتے تھے اور بہت خوش تھے، سائے کی طرح ہر وقت اُس کے ساتھ لگے رہتے

تھے۔ کسم کے لئے کامیشور نے جو کچھ کہا تھا کہ وہ اُس کی ملازمہ ہے، اُس میں اُس کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ لتا نے اپنی آنکھوں دیکھ لیا۔ کامیشور کا یہ قول حقیقت پر مبنی تھا۔ کسم لتا سے بہت زیادہ خوبصورت تھی، لیکن اس کے باوجود وہ آنکھ اُٹھا کر بھی اُس کی طرف نہ دیکھتا تھا۔ لتا مطمئن تھی اور اسے دیوتا سمجھ کر دل ہی دل میں اُس کی پوجا کرتی تھی۔

اُدھر کسم ہر روز چلے جانے کا قصد کرتی مگر نہ جا سکتی۔ کامیشور کی لاپروائی اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ یہاں رہ کر کم از کم دن میں تین چار بار وہ اُسے دیکھ تو لیا کرتی ہے۔ چلے جانے کے بعد وہ اپنے دل کو کیونکر تسلّی دے گی؟ لیکن اس عالم کے باوجود وہ بہت کم کامیشور کے سامنے آتی، دور ہی دور سے وہ اسے دیکھتی —— اور ایک ٹھنڈا سانس لے کر رہ جاتی۔ پھر بھی وہ خوش تھی، اُس کے دیوتا جو خوش ہیں۔ ان سے بات کرنے کے لئے ترستی تھی لیکن خوش تھی۔ کیا اسی کا نام خوشی ہے؟ کامیشور کو جس دن سے اُس نے دیکھا اُسی دن سے وہ اُس کی ہو گئی۔ کسی دوسری طرف دیکھنے کا اُس نے کبھی خیال بھی نہیں کیا۔ اُسے دیوتا سمجھ کر پوجتی، سوامی سمجھ کر عزت کرتی۔ اور اس کے بدلے میں آج تک اُسے مایوسی کے سوا کچھ نہ ملا۔

---

"چندا، کسم ماں کو نارائن سنا رہی ہے کیا؟"

"نہیں، بھورانی! اس وقت تو وہ اپنے کمرے میں ہے۔"

لتا اُس کے کمرے میں داخل ہوئی تو دیکھا کسم چٹائی پر پڑی رو رہی ہے۔ لتا کو رحم آ گیا۔ نہ معلوم کیا خیال کر کے روتی ہے بیچاری؟ رانیوں جیسا روپ پایا ہے لیکن قسمت!

"کسُم! تم رو کیوں رہی ہو بہن؟" لتا کا دل پسیج گیا تھا۔
وہ چونک پڑی۔ جلدی سے منھ پونچھ کر آنچل سمیٹتی ہوئی بولی: "اوہ آپ! مجھے وہیں کیوں نہ بلا لیا، بھورانی؟"
لتا اُس کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ پھر بولی: "دل ہی دل میں گھٹنے سے دکھ کبھی کم نہیں ہوتا کسُم! یہ تو معلوم ہو چکا ہے کہ تمہارے ماں باپ مر چکے ہیں اور رشتے ناتے کا کوئی کبھی نہیں ہے۔ لیکن کیا تمہارے پتی بھی زندہ نہیں ہیں؟"
کسُم دانتوں کے نیچے زبان دباتے ہوئے بولی: "ایشور ان کی لاکھ برس کی عمر کرے، بھورانی! وہ خوش ہیں، یہ دیکھ کر ہی تو میں جی رہی ہوں۔"
"اوہ! تو وہ خوش ہیں اور ایسی خوبصورت بیوی دوسروں کی محتاج ہے۔ کیسے پتھر دل ہیں وہ!"
"وہ پتھر دل نہیں ہیں بھورانی! میری قسمت ہی ایسی کھوٹی ہے وہ مجھے اپنے ساتھ رکھنے سے مجبور ہیں۔"
"ساتھ رکھنے سے مجبور ہیں تو کیا کھانا کپڑا بھی نہیں دے سکتے؟"
کسُم نے دل ہی دل میں کہا۔ وہ تو دے ہی رہے ہیں لیکن کیا اتنے سے دل مطمئن ہو سکتا ہے؟ اُف رے مجبوری! اُسے آخر جھوٹ بولنا ہی پڑا: "وہ دینا چاہتے تھے مگر میں نے نہیں لیا۔ صرف روٹی کپڑے پر۔۔۔۔"
"سمجھ رہی ہوں کسُم! تم نے اچھا کیا۔ لیکن پھر اس طرح روتی کیوں ہو؟ دل کو مضبوط کرو۔ آؤ چلو، تھوڑی دیر باغ میں ٹہلیں۔"
رات کو کھانا کھاتے وقت لتا نے کسُم کی آج کی تمام باتیں کاملیشور کو بتا دیں۔ کاملیشور چونک اٹھا۔ لیکن کچھ بولا نہیں۔ لتا نے کہا: "کتنا ظالم ہے

وہ، جو کسم ایسی خوبصورت بیوی کو اس قسم کی زندگی گذارتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ لیکن وہ بے چاری پھر بھی اپنے سنگدل پتی کی پوجا کرتی ہے، اور خوش ہے، یہی بات میرے لئے حیرت انگیز ہے!"

کامیشور نے بے پروائی سے کہا "بے چاری کسم! ہمارے ملک میں ایسی بدنصیب عورتوں کی کمی نہیں ہے لتا۔ ارے بس کھا چکیں؟ کھاؤ نا، ڈاکٹر صاحب کہتے تھے۔ بھوسانی کے کھانے پینے کا ذرا خیال رکھا کرو، ذرا دن ایسے ہی ہیں۔"

"ہٹو بھی تمہیں ایسی باتیں سوجھتی ہیں!"

کامیشور ہنسنے لگا۔ رات کو جب لتا سو گئی تو کامیشور سوچنے لگا۔ کسم! یہ تم کیا کر رہی ہو؟ تم جانتی ہو، میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میں لتا کا ہوں لیکن پھر بھی تم اس بدنصیب سے اتنا پریم کیوں کرتی ہو؟ کیوں اپنی جوانی اور خوبصورتی یوں تباہ کر رہی ہو؟ کسم! بیاہ کر لو تم! کاش ایسا ہو سکتا کہ تم بیاہ کر کے خوشگوار زندگی بسر کر سکتیں!..... کوشش کرنے سے کسم کی شادی ہو سکتی ہے۔ پرماتما کرے ایسا ہی ہو۔ کسم زندگی کے خوش کن لمحات سے ہمکنار ہو۔ نہیں تو..... نہیں تو..... کیا میں آخری سانس تک سکھی رہ سکتا ہوں۔

---

"کسم!"

کسم سر جھکائے چھالیہ کتر رہی تھی۔ چونک کر اس نے سر اوپر اٹھایا اور حیرت سے دروازہ کی طرف دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی۔ کتنی مدت کے بعد اسے اپنے پریتم کے درشن نصیب ہوتے تھے۔ کچھ دیر کے لئے آنکھیں پلک جھپکنا

بھول گئیں۔ کامیشور بھی ایک منٹ کے لئے اُسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ اُس نے دیکھا کسم کی خوبصورتی پہلے سے بہت زیادہ نکھار پر تھی۔

کسم اسنبھلی، سر کے بکھرے ہوئے بالوں اور سینے سے ڈھلکے ہوئے آنچل کو درست کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور پاس آکر شیریں لہجہ میں بولی، کہیئے؟"

کامیشور جو بات کہنے آیا تھا، کہہ نہ سکا۔ کسم کے دل کو توڑنا اس کیلئے آسان نہ تھا۔ جو کچھ بھی ہو رہا ہے ہوتا رہے۔ بدنصیب میرے ہوتے ہوئے بھی ودھوا کی زندگی گذار رہی ہے۔ لیکن وہ کر ہی کیا سکتا ہے؟ لتا کو جو اُس پر حق حاصل ہے۔ دل نے کہا۔ تو کیا کسم کو تم پر ذرا بھی حق حاصل نہیں ہو سکتا؟ اور اُس کا سر چکرانے لگا۔ قدرے گھبراہٹ سے بولا "کچھ نہیں، تم بیٹھو کسم!" اور وہ تیزی سے باہر چلا گیا۔

کسم ایک ثانیہ تک کھوئی ہوئی سی کھڑی رہی۔ پھر اُس نے جھک کر آہستہ سے، جہاں کامیشور کھڑا تھا، وہاں اپنی پیشانی رکھدی۔ اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں چاہتی سوامی! کبھی کبھی کسم کہہ کر پکار لیا کرو۔ تاکہ میرے دل کو تسلی رہے کہ میرے سوامی نے ایک دن اپنے چرنوں میں جو جگہ دی تھی، اُسے وہ بھولے نہیں ہیں!

---

کامیشور کچھ دنوں سے اُداس اُداس سا نظر آرہا تھا۔ ایک دن رات کو کھانا کھانے کے بعد لتا نے اُس کے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا "آج کل آپ چپ چپ کیوں رہتے ہیں؟"

"نہیں تو لتا!"

"آپ کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ طبیعت اُداس ہے۔"

کامیشور نے محسوس کیا کہ آج لتا کے دل میں شک پیدا ہو گیا ہے اگر اس نے وہی کچھ پوچھ لیا جسے وہ چھپانا چاہتا ہے تو کیا جواب دے گا؟ کچھ بھی ہو جھوٹ تو میں بول نہیں سکتا۔

لتا نے اُسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔ "اچھا ایک بات بتاؤ؟"

"پوچھو!"

"دیکھو، جھوٹ مت بولنا!"

"کیا پہلے کبھی میں نے تم سے کوئی بات جھوٹ کہی ہے؟"

"نہیں اس کا مجھے یقین ہے۔"

"پھر یہ کہا ہی کیوں؟ اچھا اب پوچھو جو پوچھنا ہے۔"

"کسم سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟"

"کسم سے میرا کیا رشتہ ہو سکتا ہے؟ وہ محض ہماری ملازمہ ہے اور ملازمہ سے مالک کا کوئی رشتہ نہیں ہو سکتا۔"

"یہ میں جانتی ہوں! لیکن ..... لیکن کیا ملازم ہونے سے پہلے بھی کسم سے تمہارا کوئی رشتہ نہ تھا؟"

محبت سے لتا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اُس نے کہا: "تم سے کونسی بات پوشیدہ ہے لتا! سب کچھ تو جانتی ہو! صرف یہی بات ..... جس زمانہ میں میں دنیا کو سمجھنا بوجھنا چاہتا تھا، انہیں دنوں اچانک کسم کو میں نے دیکھا اور سمجھا کہ بہت سی ایسی بھولی اور پاکدامن لڑکیاں صرف پیٹ کے لئے بدقماش لوگوں کا شکار ہوتی ہیں۔" اور کسم اُس سے کیسے ملی اور کیسے یہاں آئی۔ اُس نے سب کچھ اُس سے سچ سچ کہہ دیا اور آخر میں کہا: "اب کہو، لتا! اس میں میرا کوئی قصور ہے کیا؟"

لتا ایک دم خاموش رہی، پھر بولی "نہیں، آپ نے بہت اچھا کیا، اور اُسے اپنے یہاں جگہ دے کر ذلت سے بچالیا!...... لیکن...... لیکن.... کیا یہ درست ہے کہ وہ سوامی ہوتے ہوئے بھی...... اُس کی یہ خوبصورتی، یہ جوانی......"

کامیشور نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "اس کے لئے ہم کیا کر سکتے ہیں لتا؟ میں نے اُسی دن کہہ دیا تھا کہ میں لتا سے پریم کرتا ہوں اور اسی کا ہوں۔"

---

سویرا ہو گیا تھا۔ لتا کھڑکی میں کھڑی نیچے دیکھ رہی تھی۔ اُس نے دیکھا کسم رسوئی گھر میں جاتے اور ناشتہ تیار کرنے میں حد درجہ منہمک ہے کس کے لئے؟ اُس کے اور کامیشور کے لئے بار رخسار سرخ ہو رہے ہیں۔ کالے اور ریشمین بال شانوں پہ بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے ہیں۔ شاید وہ ابھی ابھی نہا کر آئی تھی۔ پانی کی بوندیں بالوں سے ٹپک رہی تھیں۔ دو تین کچوریاں کڑاہی سے نکالنے کے بعد چندا کو آواز دے کر اُس نے کہا "ناشتہ تیار ہے اوپر دے آؤ، نہیں تو ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

عین اسی وقت پیچھے سے کسی نے کہا "اتنے غور سے کیا دیکھ رہی ہو بھابی؟"

لتا نے چونک کر پیچھے مڑ کر دیکھا اُس کی ساس کا بھانجا ہریش کھڑا ہے۔ یہ لڑکا ایک ہونہار ڈاکٹر تھا۔ مسرت آگیں لہجہ میں بولی "ارے تم کب آئے؟"

"بس چلا ہی آرہا ہوں، دیکھوں، کیا دیکھ رہی ہو؟"

ہریش، کسم کو دیکھ کر حیرت سے بولا "یہ.... یہ کون ہے بھابی؟"

"ملازمہ ہے اور کون ہے؟"

ہریش کھلکھلا کر ہنستا ہوا بولا"خوب! کیا کہنے ہیں بھائی صاحب کے بھی؟ ملازمہ بھی بس...... ایک نمبر کی چھانٹ کر رکھی ہے!"

کاملیشور اٹھ بیٹھا۔ آنکھیں ملتا ہوا بولا۔"ہریش! تم کب آتے؟ کیا سیدھے کلکتہ سے چلے آ رہے ہو؟"

ہریش کاملیشور کے پاؤں چھوتے ہوئے بولا"جی ہاں! وہیں سے آ رہا ہوں۔"

"بواجی تو اچھی ہیں؟"

"ہاں! تمہیں دعائیں دی ہیں۔"

چندا چائے لے آئی، تینوں چائے پینے لگے۔ ہریش اور کاملیشور اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔ اور لتا سوچ رہی تھی۔ کیا؟ اس کے دل میں میری طرح ایک بڑے گھر کی رانی بننے کی چاہ نہ ہوتی ہوگی۔ جب ابھی اس نے جوانی کے مہکتے ہوئے گلشن میں قدم رکھا تھا۔ جب یہ پوری طرح جوان ہوگئی تھی۔ جب جوان آرزوؤں نے اس کے دل میں چٹکیاں لینا شروع کی تھیں، انھیں دنوں خوبصورت شوہر کی خواہش نے بھی اس کے دل کو ضرور گدگدایا ہوگا۔ مگر بُرا ہو غریبی کا کہ پیٹ کے لئے اسے کیا کرنا پڑا۔ پھر بھی قابل احترام ہے کسُم جو اس دوزخ سے اس طرح نکل آئی اور آج اسی عمر میں ایک پاکدامن کی طرح اپنے پریتم کے گھر رہ کر، داسی کی طرح ان کے کنبہ کی سیوا کر رہی ہے۔ کون کہتا ہے کہ کسُم گناہگار ہے؟ وہ دیوی سے کسی طرح کم نہیں۔

اسی وقت ہریش بولا"ارے، تم کیا سوچ رہی ہو بھابی؟"

"کچھ نہیں، کیا چلئے اور بناؤں؟"

"جی، یہی تو...... اسی لئے تو آپ کے انہماک میں مخل ہونے کی

ضرورت محسوس ہوئی۔"

"لتا! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" کاملیشور نے اُس کے چہرہ کی طرف غور سے دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں! آپ فکر نہ کریں۔ میں بیچاری کسم کے بارے میں سوچ رہی تھی۔"

"اُس کے بارے میں سوچنا کیا؟ ہمارے یہاں اُسے کیا کوئی تکلیف ہے؟"

"تکلیف؟ نہیں نہیں، کوئی تکلیف نہیں۔" پھر دل ہی دل میں بولی "تم کیا سمجھو، تم مرد ہو۔ عورت کے دل کی بات عورت ہی سمجھ سکتی ہے۔"

---

تالاب کے کنارے پر بیٹھی ہوئی دونوں پاؤں پانی میں لٹکائے کسم گا رہی تھی۔

راتیں نہ رہیں وہ، نہ رہے دن وہ ہمارے
اب تو ہی بتا دے کہ جئیں کس کے سہارے

لتا چلتی چلتی رک گئی۔ ہریش اور کاملیشور بھی غور سے سننے لگے۔ کسم نے گاگر بھری اور آہستہ آہستہ وہاں سے چل کر حویلی میں داخل ہو گئی۔ ہریش نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "کتنی سُریلی آواز ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ تمہاری کسم ہی تھی۔ کیوں بھابی؟"

"ہاں وہی تھی، کتنا پُر درد گانا تھا، اب تو ہی بتا دے کہ جئیں کس کے سہارے۔"

کاملیشور کچھ نہیں بولا۔ وہ چپ چاپ ٹہلنے لگا۔ اُس کا دل نہ جانے

کیوں بے چین ہو اٹھا۔ وہ سوچنے لگا نہیں نہیں، ہم دونوں کبھی اکٹھے نہیں رہ سکتے، کیوں نہ ہریش کے ساتھ کلکتہ چلا جاؤں، بوا کو دیکھے ہوئے بھی بہت دن ہو گئے اور وہ گھوم کر بولا۔ "لتا آؤ ہم تم ہریش کے ساتھ کلکتہ چلیں تمہیں دیکھ کر بوا بہت خوش ہوں گی۔"

لتا جلد ہی سمجھ گئی کہ کامیشور کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا تو کیوں ہوا ہریش مسکراتا ہوا بولا۔ "نہ جانے آپ نے کون سے خیال میں کلکتہ جانے کے متعلق سوچا ہے۔ بھابی ایسی حالت میں کیسے سفر کر سکتی ہیں۔"

لتا شرما گئی، اور کامیشور "اوہ" کہہ کر رہ گیا۔

---

کامیشور کا آج جنم دن تھا۔ گھر کا بچہ بچہ مسرور نظر آرہا تھا۔ لتا کے کاکا بھی آئے تھے اور بھی رشتے دار مرد عورتیں سبھی آتے ہوتے تھے۔ ہریش باہر کے کام میں مصروف تھا۔ شامیانے کے باہر اور شامیانے کے اندر بجلی کی روشنی کا انتظام کیا جارہا تھا۔ اندر کسم بھی کام کاج میں مصروف تھی۔ کمر کے گرد آنچل لپیٹے ماں کے اشاروں پر کام کر رہی تھی۔

لتا کھڑکی میں کھڑی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ ہریش ایکبار کچھ لینے اس کمرے میں آیا اور ہنستا ہوا کہہ گیا۔ "ہوں، خوب آرام سے بیٹھی ہو۔ ایسی حالت نہ ہوتی تو اتنا کام کرواتا کہ تم بھی یاد کرتیں، بھابی!"

اس نے جواب دیا تھا۔ "کیا نہ کراتے؟ جیسے خود بانسوں پر نٹوں کی طرح اچھل رہے ہو۔ لو لے جاؤ چابی۔ نیچے منیم جی پکار رہے ہیں۔"

اور اس کے چلے جانے کے بعد لتا پھر کھڑکی میں کھڑی ہو گئی۔ کسم مصری کا تھال اٹھائے رسوئی گھر میں داخل ہو رہی تھی۔ لتا نے دیکھا۔ اسکی

پیشانی آج بھی سونی ہے۔ نہ جانے کیوں آج اُس کا کلیجہ دھک دھک کر اُٹھا۔ آج اُن کا جنم دن ہے اور کسم انھیں اپنا سوامی مانتی ہے، پھر اُسکی مانگ سیندور کے بغیر کیوں؟ نہیں نہیں، میں یہ برداشت نہیں کر سکتی، اور وہ نیچے جانے کے لئے کمرے سے باہر نکلی۔ دیکھا کا میشور اُس کے کاکا کو لئے آرہے ہیں۔ لتا نے اُنھیں پرنام کیا اور "ابھی آئی کاکا" کہہ کر نیچے اتر آئی۔

"بہت تھک گئی ہو کسم!"

"نہیں تو جی جی!" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

لتا بنچ پر بیٹھ گئی۔ اور اُسے بھی پاس بٹھاتے ہوتے بولی۔ "کسم تم نے ایک دن کہا تھا میرے سوامی ہیں....؟"

"ہاں جی جی۔"

"تو پھر سوامی کے ہوتے ہوتے اس طرح سونی مانگ لئے کیوں پھرتی ہو؟"

کسم نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "مانگ وانگ بھرنے کا موقع ہی کہاں ملا جی جی۔ ایک رات کی رسم کے بعد میں ہمیشہ کے لئے اُن سے دور ہو گئی یا قسمت نے مجھے اُن سے دور کر دیا۔"

"پھر بھی میں آج تمہیں ایسے ہی نہ رہنے دوں گی۔ چلو میرے کمرے میں، تیار ہو کر تمہیں میرے ساتھ پارٹی میں بھی رہنا ہوگا آج شام کو۔"

"ایسا مت کرو جی جی! اس گھر کے مالک مجھ پر ناراض ہوں گے۔"

"وہ میں دیکھ لوں گی، تم اُٹھو تو۔" اور وہ اُسے کھینچ کر اپنے کمرے میں لے آئی۔ اور جب سب چائے پی رہے تھے تو ہر ایک کی نگاہ کسم کے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ چائے کے بعد سب ہریش کے پیچھے پڑ گئے کہ وہ گانا سنائے۔

ہریش آخر رشتہ داروں کے اصرار سے مجبور ہوکر پیانو کے پاس جا بیٹھا اور گانے لگا۔

کوئی تو اُنھیں جا کے یہ پیغام مرا دے
اِک روتا ہوا دل تمھیں دن رات پکارے
اب تو ہی بتا دے کہ جئیں کس کے سہارے

سب نے واہ واہ کی تالیاں بجائیں اور کہا۔" اسے پورا کرو ہریش!"

ہریش نے معافی مانگتے ہوئے کہا۔" بس مجھے تو اتنا ہی یاد ہے۔ اگر آپ لوگ یہ گیت پورا ہی سننا چاہتے ہیں تو بھابی سے کہیے یہ اپنی سکھی کسم رانی سے سنوائیں گی۔"

کسم کا چہرہ سرخ ہو گیا وہ سر ہلانے لگی۔ لیکن لتا نہیں مانی۔ مجبوراً وہ ہریش کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ ہریش پیانو بجانے لگا اور کسم گانے لگی۔

راتیں نہ رہیں وہ، نہ رہے دن وہ ہمارے
اب تو ہی بتا دے کہ جئیں کس کے سہارے

کسم کے گانے کی سب ہی نے تعریف کی اور ہریش تو اُس کی طرف دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ نہ صرف کسم کی آواز میں جادو تھا بلکہ اُس کی آنکھوں میں بھی جادو پنہاں تھا لیکن کامیشور نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ دل پر پتھر رکھے لتا کے پاس بیٹھا رہا۔

پارٹی ختم ہوئی سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے لیکن ہریش اپنا سب کچھ کھو چکا تھا۔ وہ کھویا کھویا سا کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ کسم سمجھ گئی!

چھ مہینے گذر گئے۔ لتا کی گود میں تین مہینے کا چاند سا بیٹا کھیل رہا تھا۔ کسم اب گھر کے دیگر کاموں کی طرف زیادہ توجہ نہ دیتی تھی۔ دن رات اسی کھلونے میں اُلجھی رہتی۔ کاملیشور کے سامنے تو وہ نہ آتی۔ البتہ اُس کی عدم موجودگی میں تمام دن اُس کے کمرے میں رہتی۔

اسی اثناء میں لتا بیمار پڑ گئی۔ کاملیشور نے ہریش کو کلکتہ تار دیا اور تیسرے دن وہ آ پہونچا۔ لیکن اسے دیکھ کر سب کے سب محو حیرت رہ گئے۔ بہت کمزور ہو گیا تھا وہ، اُس کا سڈول جسم صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ زرد چہرہ، سوکھے ہونٹ! کاملیشور کی ماں بولی "ارے! کیا ہو گیا تجھے بیٹا؟"

اُس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوتے کہا "کچھ نہیں موسی! یونہی ذرا کام کی زیادتی کے باعث ....."

لتا اور کاملیشور نے بھی بہت پوچھا ہریش بولا "ذرا کمزور ہو جانے کی وجہ سوائے ملیریا کے اور کیا ہو سکتی ہے؟ یہی کچھ بھابی کو ہے۔ آپ تو یونہی گھبرا جاتے ہیں، بھائی صاحب! دیکھئے بھابی کا علاج کرتے کرتے میں بھی ٹھیک ہو جاؤں گا۔" ایک مہینہ گذر گیا۔

کسم جب بچے کو کسی طرح نہ بہلا سکی تو اسے لے کر باغ کی طرف برآمدے میں چلی گئی اور کہنے لگی "ارے میرے چندا! کوئی روتا ہے اس طرح؟ لوگ کہیں گے کسم کا راجہ بیٹا روتا ہے۔"

بچہ ہنس پڑا۔ کسم نے اُس کے منہ پر اپنا منہ رکھتے ہوتے کہا۔

"اچھا، بیٹا! بتاؤ تو، تو میرا بیٹا ہے یا جی جی کا؟"

بچہ نہ جانے کیا سمجھا اور کیا نہ سمجھا۔ مگر بے اختیار اُس کے منہ سے

نکلا: "ماں!"

کسم کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلک پڑے بولی "ہاں، ماں کے لال!" اور اُسے اپنی چھاتی سے چمٹا لیا۔

ہریش نے پاس آکر کہا "کسم!"

وہ چونک اُٹھی، ہریش کو اُس سے پریم ہے۔ وہ یہ جانتی ہے۔ اُسکی یہ حالت دیکھکر کئی بار اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ لیکن وہ کیا، ایشور کی ہے۔ مجبور ہے۔ کیا کرے؟ بولی "کہیے؟ دیکھئے تو آپ کا بھتیجا کتنا تنگ کرتا ہے!"

ہریش نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کسم! میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"کسم بولی "پوچھئے"

"میری حالت سے تم ناواقف تو نہیں ہو؟"

"جی نہیں"

"تو.....تو..... تم کیا میرے ساتھ.....؟"

حیرت سے وہ ہریش کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر افسردہ لہجہ میں اُس نے کہا "ہریش بابو! میری مانگ کی طرف دیکھو! میں...... میں بیاہتا استری ہوں۔"

"بیاہتا!" ہریش نے دل ہی دل میں آرزوؤں کا جو محل تیار کیا تھا۔ یک لخت مسمار ہو کر رہ گیا۔ اُس کے چہرے پر سفیدی سی چھاگئی۔ سر چکرانے لگا۔ وہ کھڑا نہ رہ سکا۔ اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

"مجھے معاف کرنا کسم! میں بڑا بد نصیب ہوں!"

اور وہ پھر کوشش کر کے اٹھا اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے

باغ کے باہر نکل گیا.....

کاملیشور اور لتا باغ میں ایک بنچ پر بیٹھے چاندنی کے دلکش نظارے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ہریش آیا اور کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد بولا۔

"اب تو بھابی کو آرام ہے بھیا۔ میں کل چلا جاؤں گا۔"

"لیکن تم نے تو کہا تھا ہریش کہ بھابی کو آرام ہوتے ہی تمہاری حالت بھی درست ہو جائے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔"

ہریش مسکرا دیا اور پھر یکایک لتا کی طرف گھوم کر بولا: "بھابی! تم نے بڑی بھول کی، کسم کی ساری کہانی سنائی، مگر یہ نہیں بتایا کہ وہ شادی شدہ ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو کون ہے اس کا وہ ظالم شوہر! جس نے پھول سی لڑکی کو جہنم میں جھونک رکھا ہے؟..... وہ کہتی ہے میں بیاہتا ہوں۔"

کاملیشور نے سر جھکا لیا۔

لتا بولی: "میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ اس کا سوامی مجبور ہے۔"

"یہ کیسی مجبوری ہے بھابی؟"

"ہریش" کہتا ہوا کاملیشور اٹھ کھڑا ہوا، اور تیزی سے کمرے کے اندر چلا گیا۔

لتا نے سرگوشی کے لہجہ میں کہا: "تمہیں کہو کیا کیا جائے؟ وہ..... وہ تمہاری ہی بھابی ہے؟"

"میری بھابی!" ہریش جیسے آسمان سے زمین پر گر پڑا ہو۔

---

"کسم!"

کسم نے کامیشور کی شناسا سی آواز سنی اور بچے کو پالنے میں لٹاتی ہوئی بولی

"کہیے!"

"کیا تم ..... کیا تم ..... میرا ایک کہنا کر سکو گی؟"

"آپ کا حکم ہی میرے لئے سب کچھ ہے۔ کہیے کیا حکم ہے؟"

"نہیں! لیکن ..... لیکن ..... کسم! میں میں اگر تم بیاہ کر لو تو ....."

"بیاہ!" کسم کا چہرہ فق ہو گیا۔ بولی: "میرا بیاہ تو ہو چکا ہے۔"

"وہ بھی کوئی بیاہ تھا کسم! یہ تمہاری بھول ہے۔ اس طرح اپنی زندگی تباہ نہ کرو۔"

"میری بھول ہے! یہ آپ کہہ رہے ہیں؟ لیکن ایسا حکم دینے کی آپ کو ہمت کیسے ہوئی؟ یہ میں جانتی ہوں کہ میں ایک بُری لڑکی تھی۔ میرا مذہب ہی کیا، کچھ بھی ہو۔ میں پہلے چاہے کچھ بھی تھی۔ پھر بھی ..................

بیاہ صرف ایک بار ہوا کرتا ہے۔" کسم کا دل بھر آیا۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

کامیشور پریشان سا ہو کر واپس چلا گیا۔

---

ہریش کے دل پر کچھ ایسی چوٹ لگی کہ وہ سنبھل نہ سکا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک دو دن کے اندر چارپائی سے لگ گیا۔ ایک ڈاکٹر آتا اور ایک جاتا لیکن ہریش کو ذرا بھی افاقہ نہ ہوا۔

"ہریش بابو کی طبیعت کیسی ہے جی جی؟"

لتا نے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا: "اب تو صرف ایشور ہی نگہبان ہے کسم! ڈاکٹروں نے تو جواب دیدیا۔ ہائے۔ کیسا ہنس مکھ اور خوبصورت جوان

تھا۔ آج تمہاری محبت نے اُسے خاک میں ملا دیا۔"

"میں بڑی بدنصیب ہوں جی جی۔"

"تمہارا اس میں کیا قصور ہے کُسم! اس کی قسمت ہی ایسی تھی۔"

کیا میں ایک بار اُن کے کمرے میں چلی جاؤں جی جی؟ وہ اپنے دل میں..... کچھ بھی سمجھیں..... لیکن میں تو..... نہیں....."

لتا نے طنزاً مسکراتے ہوئے کہا: میں تو انھیں اپنا دیور ہی سمجھتی ہوں ٹھیک ہے کُسم؟"

"تو کیا جی جی، تم....."

"ہاں کُسم! یہ بات مجھ سے پوشیدہ نہیں۔"

کُسم لتا سے لپٹ گئی اور اپنا منہ اُس کے پہلو میں چھپا لیا۔

پیار سے لتا نے اُس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا: جا نیچے تیرا بیٹا رو رہا ہے۔ چندا تجھے پکار رہی ہے...... اور سن کُسم! رات کو ایک بار ہریش کو دیکھنے ضرور جانا۔"

"اچھا جی جی!"

---

"اب کیسی طبیعت ہے؟"

"کون؟..... کُسم بھابی! آؤ، آج تو کچھ اچھا ہوں..... پہلے یہ بتاؤ تم نے مجھے معاف کر دیا ہے نا؟"

کُسم نے ہریش کے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: اپنوں پر بھی بھلا غصہ کیا جاتا ہے؟"

"تم بڑی اچھی ہو کُسم بھابی!"

"اچھا ہریش بابو، آپ کیا اس بدنصیب کو بھول نہیں سکتے ہو؟"

"اب ان باتوں سے کیا فائدہ کسم! جب تم جاننا ہی چاہتی ہو تو بتلائے دیتا ہوں۔ جب تک میں زندہ ہوں تمہیں ہرگز ہرگز نہیں بھول سکتا۔"

"ایسا مت کہو ہریش بابو! میرے سوامی اور میری جی جی مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔ کیا میرے مرنے سے تمہیں سکھ نصیب ہو سکتا ہے؟"

پاگلوں کی طرح ہریش ہنس پڑا۔ اور بولا "شاید تمہارے مرنے سے مجھے سکون حاصل ہو سکے۔"

کسم ہنسی، بولی "یہ تو معمولی بات ہے۔ اگر میرے مرنے سے آپ کو شانتی نصیب ہو سکتی ہے تو زہے نصیب، پرماتما کرے ایسا ہی ہو۔"

"میز پر سے یہ تم نے کیا اٹھایا ہے؟" ہریش نے پوچھا۔

"کچھ نہیں، تھرمامیٹر لڑھک جاتا۔ ٹھیک رکھ دیا ہے۔ کیا آپ گانا سنیں گے؟"

"ضرور سناؤ۔ تمہارے گانے میں جادو ہے، جادو کسم۔"

ہریش کی چھاتی پر جو دوائی ملی جاتی تھی۔ وہ ایک قسم کا بہت ہی تیز زہر تھا۔ کسم نے اسے ہی میز پر سے اٹھایا تھا اور ہریش سے نظریں بچا کر پی گئی تھی۔

سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے وہ بولی "اچھا اس شرط پر گاتی ہوں کہ آپ سونے کی کوشش کریں۔ اور میں گاتی رہوں۔"

ہریش راضی ہو گیا اور آنکھیں بند کر کے بولا "لیکن وہی گیت گانا راتیں نہ رہیں وہ......"

کسم گانے لگی۔ زہر اندر ہی اندر اپنا کام کر رہا تھا۔ وہ بہت دلفریب

اندازے سے نہ جانے کتنی دیر تک جھوم جھوم کر گاتی رہی۔ ہریش سو گیا۔

صبح جب لتا کمرے میں داخل ہوئی تو کسم ہریش کے پلنگ کے پاس ہی آرام کرسی پر گہری نیند سو رہی تھی لتا نے اُسے شانوں سے پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔ "واہ! رات دیور کی دیکھ بھال میں اتنی محو ہوئیں کہ بیٹے کو بھی بھول گئیں۔"

لیکن کسم کہاں تھی؟ اُس کا جسم برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ گردن کرسی کی پیٹھ پر تھی۔ گلاب کے پھول کی پتی سے بھی زیادہ نازک لال لال ہونٹ زہر سے نیلے پڑ گئے تھے۔ لتا چلا اٹھی۔

ہریش گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ ڈاکٹر تھا۔ اُسے یہ معلوم کرنے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کہ کسم نے زہر کھایا ہے۔ وہ پاگل سا اُس خوبصورت پرتما کی طرف دیکھنے لگا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کہہ رہی ہے "میرے مرنے سے تمہیں شانتی نصیب ہوگی نا، یہ پہلے ہی کیوں نہ کہدیا ہریش بابو؟ اتنے دن تک اتنی تکلیف میں مبتلا کیوں رہے؟"

سارا گھر اکٹھا ہو گیا۔ کسم کو نیچے لے جانے کے لئے نوکروں نے اُسے اٹھانا چاہا، پاگلوں کی طرح ہریش چلا اٹھا۔ "خبردار! اسے ہاتھ مت لگانا وہ شادی شدہ ہے! بھائی صاحب! آپ..... آپ..... اور وہ بے سُدھ ہو گیا۔

لتا نے کاملیشور کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ٹھیک کہتا ہے ہریش! آپ ہی اُسے نیچے لے چلئے۔"

کاملیشور نے کسم کو اٹھا لیا۔

لتا نے نہلا کر اُسے بڑی اچھی طرح سجایا اور پھر سب کے سامنے اُس کے پیروں پر اپنا سر رکھ دیا۔ "قابل احترام تھیں تم دیوی! تم سے بڑھ کر

ستی اور کیا ہو سکتی ہے مجھے آشیرباد دیتی جاؤ! تمہاری ہی طرح ماتھے پر سیندور لگا کر میں..... میں.....“

ماں نے اُسے الگ کرتے ہوئے کہا: ”اب اُسے جانے دے بیٹی! سچ مچ یہ کوئی دیوی تھی۔“

”نہیں ماں! ابھی ایک کام اور رہ گیا ہے۔ اس کے بیٹے کو لا دے اُس کے ماتھے پر کستم کے....... پیروں کی خاک لگاؤں گی۔ پھر نہ جانے کب آئیگا بیچارا ایسی ماں؟“

ماں اُسے پکڑ کر باہر لے گئی.....

---

کاملیشور نے اپنے ہاتھوں کستم کو چتا پر لٹا دیا اور جی بھر کر اُس کے مکھڑے کو دیکھ کر آگ لگا دی۔ چتا کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ کاملیشور دل ہی دل میں کہہ رہا تھا جاؤ دیوی! آج تک تمہارا دل میری وجہ سے اسی طرح جلتا رہا ہے۔ ایشور سے پرارتھنا کرتا ہوں، کہ وہ تمہیں ”امر شانتی“ دے۔

ہریش پاگل ہو گیا۔ وہ ہر وقت یہی چلاتا رہتا! ”اسے ہاتھ مت لگانا یہ دیوی ہے!“

اور ایک مہینہ بعد وہ بھی کستم کے پاس پہونچ گیا۔

# اندرا

باپ کی موت کے بعد اندرا کو کالج چھوڑ دینا پڑا، کیونکہ وہ اپنے والدین کی اکلوتی لڑکی تھی۔ گھر میں بیوہ ماں کے سوا اب کوئی نہ تھا جو اُن کے پیٹ کی بھوک اور تن کی ضرورت کو پورا کرتا، اسلئے اُسے مجبوراً کسی کام کی تلاش کرنی ہی پڑی۔

کالج چھوڑتے وقت اندرا کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اُس کی تقدیر کے لکھے کو مٹا رہا ہے لیکن وہ تو اپنی بگڑی ہوئی تقدیر کو بنانا چاہتی تھی۔

اندرا کے پتا اُسے ایک کامیاب لیڈی ڈاکٹر کی حیثیت میں دیکھنے کے خواہشمند تھے مگر اندرا کا رجحان موسیقی کی طرف تھا اور وہ آسمان موسیقی پر آفتاب بن کر جگمگانا چاہتی تھی۔ لیکن باپ کی مرضی کے خلاف ایک قدم اٹھانا بھی اُس کے لئے باعث نفرین تھا، مجبوراً سر تسلیم خم کئے بغیر نہ رہ سکی اور اپنی تمام تر توجہ ڈاکٹری کی تعلیم کی طرف مبذول کر دی مگر جب کبھی اُسے موسیقی کی

مست و مدہوش کن تانوں کا خیال آجاتا تو بیقرار ہو اٹھتی اور سوچتی کہ پتا جی نے مجھے نہ جانے کیوں اس ڈاکٹری کی طرف دھکیل دیا، جبکہ میرا گلا اتنا سریلا اور آواز اس قدر لوچدار ہے کہ میں ایک کامیاب مغنیہ بن سکتی تھی ——— موسیقی کی وہ پجارن تھی۔ اُس کی زندگی کا ہر سانس موسیقی سے وابستہ تھا اور ڈاکٹری کی تعلیم کے لئے تو اُسے مجبور کیا گیا تھا۔ ورنہ ڈاکٹری اُس کے نزدیک، اس کی اپنی زندگی کے لئے زہر میں بجھے ہوئے نشتر سے کم نہ تھی!

اُس کی زندگی کی یہ سب سے بڑی آرزو جسے وہ باپ کی زندگی میں تھپک تھپک کر سلانے پر مجبور ہو گئی تھی، باپ کی موت کے بعد پھر سے جاگ اُٹھی اور اندرا کے دماغ نے فوراً ہی ایک اسکیم تیار کی جس سے اُس کا شوق بھی پورا ہوتا رہے اور اُس کی اپنی ضروریات زندگی کے علاوہ اُس کی بیوہ ماں کی زندگی کی ضرورتوں کا سوال بھی حل ہوتا رہے۔ اندرا فن موسیقی میں اچھی خاصی ماہر تھی۔ اس لئے دوسروں کو موسیقی کی تعلیم دینا اُس کے لئے کوئی مشکل نہ تھا۔ اُس نے "اندرا میوزک کالج" کے نام سے موسیقی کی ایک درسگاہ قائم کر دی۔ تھوڑے سے عرصہ میں کامیابی نے اُس کے قدموں پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا۔ اُسے کچھ گھریلو ٹیوشنیں بھی مل گئیں۔ وہ اس کے علاوہ ریڈیو پر گانے کا موقع بھی مل گیا اور ہفتہ میں کم از کم دو بار اُس کے گانے ریڈیو سے براڈکاسٹ ہونے لگے۔ اُس کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو بر آئی۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی تھی۔

مگر اس طرف سے اب اس کی طبیعت بھر چکی تھی اُس کے وہ گانے جو سننے والوں کی روحوں میں بے چینی اور زندگیوں میں ایک اضطراب پیدا کر دیتے تھے، سینکڑوں دلوں میں سیماب کی تڑپ پیدا کر دیتے تھے کیا اُس کی روح

میں بھی اضطراب پیدا کر سکے؟ اس کے دل کو بھی ماہئ بے آب کی طرح تڑپا سکے؟

اندرا گاتی تھی اور گانا سکھاتی تھی اور فرصت کے وقت کچھ سوچتی رہتی تھی نہ جانے کیا؟ اکثر سوچتے سوچتے وہ اپنا سینہ مسوس کر رہ جاتی تھی، نہ جانے کیوں؟

اسی طرح اندرا کی زندگی ڈگمگا رہی تھی کبھی اس کا چہرہ مسرت کے نور سے جگمگا اٹھتا تھا اور کبھی ـــــ نہ جانے کس خیال کے زیر اثر اس کے چہرے پر مایوسی چھا جاتی تھی۔ اندر ہی اندر اس کا دل نہ جانے کس کشمکش میں مبتلا تھا کہ انہی دنوں کمار اس کی حریم زندگی میں داخل ہوا۔ اس کی بہت سی آرزوئیں اندرا سے وابستہ تھیں۔ اس نے اندرا سے کہا "اندرا تم نہیں جانتیں کہ تمہارے کالج چھوڑ دینے سے ایک روح کتنی مضطرب اور کس قدر بے چین ہو گئی ہے اور تم جان بھی کیسے سکتی ہو میں تمہارا پرستار ہوں، تمہاری پرستش کرتا ہوں مگر کبھی ایک لفظ بھی تم سے کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ہمیشہ یہی سوچتا رہا کہ میں اپنے سینے کو چیر کر تمہیں کیونکر دکھاؤں"

اور نہ جانے کیا سوچ کر اندرا زیر لب مسکرا دی۔

مگر کمار کہے جا رہا تھا۔ اندرا اب مجھے کالج کی زندگی اچھی نہیں لگتی، جانتی ہو اندرا، میڈیکل کالج میں، میں کیوں داخل ہوا؟ تمہارے لئے ـــــ صرف تمہارے لئے! یاد ہے اندرا، کالج میں داخل ہونے سے پہلے تم نے ایک دن ریڈیو پر یہ گانا گایا تھا۔

وہ مدھر ملن کی پہلی گھڑی
وہ پریم پیار کی پہلی جھڑی
میں کانپ رہی تھی کھڑی کھڑی

پنی دھیرے دھیرے آگے بڑھے اور پریت کی ریت سکھانے لگے

یہی وہ گیت تھا جس کے سننے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ تم میرے دل کے آئینے میں اتر آئی ہو، تمہاری جادو بھری آواز نے میری قوت سامعہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا مطیع کر لیا۔ آنکھوں کو تمہیں دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا اور آخر ایک دن تم نظر آئیں میں تمہیں دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا، مگر تم میرے قریب سے اس شان بے نیازی سے گذر گئیں جیسے ایک بھکاری کے قریب سے ایک مغرور سرمایہ دار بے پروائی سے گذر جاتا ہے لیکن، یقین مانو، میں تو ایک بار دیکھا ہے دوبارہ دیکھنے کی ہوس کا شکار ہو کر رہ گیا۔ ہر وقت، ہر لمحہ تم ہی تم پیش نظر رہنے لگیں، اور جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ تم میڈیکل کالج میں داخل ہو رہی ہو تو میں نے بھی یہی راہ اختیار کی اور کالج میں داخل ہو گیا اور جب تم کالج سے علیحدہ ہوئیں تب بھی میں نے تمہارا ساتھ دیا اور ہمیشہ کے لئے کالج چھوڑ دیا۔"

اندرا چپ چاپ سن رہی تھی، وہ کمار کو کلاس کے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے روزانہ دیکھتی تھی اور یہ بھی دیکھتی تھی کہ وہ اکثر سائے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے کچھ فاصلہ پر رہا کرتا تھا اور کتنی ہی بار آنکھوں ہی آنکھوں میں اس نے کچھ کہا بھی تھا اور اندرا سب کچھ سمجھ جانے پر بھی ایسی ہی بنی رہی جیسے وہ کچھ بھی تو نہیں سمجھی۔ اندرا جوان تھی، اس کا ساغر زندگی جوانی کی تیز شراب سے لبریز ہو چکا تھا۔ حسن پورے شباب پر تھا اور دل کی جوان امنگیں بس ۔۔۔ وہی کچھ چاہ رہی تھیں اور اُسی جذبۂ لطیف کی متمنی تھیں جو کمار کو اپنے اصل مرکز سے لے آیا تھا۔ لیکن کمار اپنے اصل مرکز کے قریب پہونچ جانے پر بھی اُس سے ابھی تک دور ہی تھا۔ گوہر امید اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ مگر آگے بڑھ کر اُسے اٹھا لینے کی اس میں ہمت نہ تھی، کوشش کرنے پر بھی وہ اپنے دل کا راز اندرا کے کانوں تک نہ پہنچا سکا اور

نہ اندرا ہی کو کبھی اپنی چاہت کے تقاضے کی جرأت ہوئی اسی اثنا میں اندرا کو اپنے باپ کی بے وقت موت کے باعث کالج چھوڑ دینا پڑا۔ اور اس طرح یہ دونوں ایک دوسرے کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

مگر آج جبکہ اندرا اپنے میوزیکل کالج کے ایک کمرہ میں بیٹھی ایک گیت لکھ رہی تھی لڑکیاں اپنے اپنے گھروں کو جا چکی تھیں اور اس کی ماں اندر کے کمرے میں کسی کام میں حد درجہ مصروف تھی وہ یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی کہ "آپ جو کچھ چاہتے ہیں اس کے متعلق آپ نے اچھی طرح سوچ لیا ہے نا؟ آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ آپ کے والدین مجھ ایسی گا بجا کر پیٹ پالنے والی لڑکی سے آپ کی شادی کرنا پسند کریں گے؟ کیا آپ ان کے خلاف قدم اٹھانے کی جرأت کر سکتے ہیں؟ اگر کبھی ایسا موقعہ آجائے تو آپ مجھے دھوکہ تو نہ دیں گے؟"

کمار نے فوراً ہی جواب دیا: "ایسا کبھی نہیں ہو سکتا اندرا! تم نہیں جانتیں میرے کالج چھوڑنے پر پتا جی مجھ پر کس قدر ناراض ہوئے ہیں....."

اندرا بولی: "تو کیا آپ نے کالج چھوڑ دینے کی اصل وجہ انہیں بتا دی تھی؟"

اندرا کو جواب کی ضرورت نہ تھی اور کمار جواب دے بھی نہ سکا۔ وہ تو پروانے کی طرح شمع پر اپنی زندگی قربان کر دینا چاہتا تھا۔ بولا: "اندرا یہ سب باتیں پوچھ کر تم مجھے ناامیدی کے غار میں نہ دھکیلو۔ میں تمہاری زبان سے ایک لفظ سننے کا متمنی ہوں۔ تم چاہو تو میری کشت آرزو کو سیراب کر سکتی ہو، میری زندگی کو مسرت کے نور سے جگمگا سکتی ہو اور چاہو تو اپنے ایک لفظ سے میری آرزوؤں کا خون کر کے میری زندگی کو فنا کی ٹھوکروں سے ٹھکرا سکتی ہو اندرا!

ہم ایک ایسے ہی راستے کے مسافر ہیں، موسیقی مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ کیا ہم ایک ہو کر موسیقی کی لافانی دیوی کی پوجا نہیں کر سکتے؟"

اندرا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ جانتی تھی کہ کمار اس کی زندگی میں جو کچھ بھی لے کر آیا ہے وہ اس کی زندگی کے لئے کچھ کم نہیں۔ وہ بھی تو کچھ دنوں سے ایک ساتھی کی ضرورت محسوس کر رہی تھی ـــــ اور جب ایک دن کمار نے اُسے آکر بتایا کہ اُس کے پتا جی کی طرف سے اُسے اپنی راہ تلاش کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہو گیا ہے تو اندرا بے اختیار کہہ اٹھی "کمار! بھگوان نے ہمیں ایک دوسرے کے لئے ہی پیدا کیا ہے، اب ہم دور دور رہ بھی کیسے سکتے ہیں؟"

اور وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت ہی قریب ہو گئے، اندرا کی ماں نے اس میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ڈالی۔ کمار اس کی نگاہوں میں اندرا کا ہونے والا شوہر تھا ـــــ وہ میوزک کالج میں آکر گانا سیکھنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کو موسیقی کی تعلیم دینے لگا۔

---

ایک دن کمار کے پتا اُس کی تلاش میں میوزک کالج میں آپہنچے۔ اندرا اُنہیں نہیں جانتی تھی۔ انہوں نے اندرا سے کمار کا پتہ دریافت کیا۔ کمار ابھی نہیں آیا تھا، اس لئے اندرا نے انہیں ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ آپ تشریف رکھئے، وہ ابھی آتے ہی ہوں گے۔"

مگر انہوں نے کوئی جواب نہ دیا اور الٹے پاؤں واپس چلے گئے۔ اُس دن کمار کالج میں نہ آیا اور دوسرے دن بھی اندرا نے اُس کا بہت انتظار کیا۔ تیسرے دن اندرا کو اس کا خط ملا جس میں لکھا تھا:۔

میری اندو!

پتاجی نے مجھے زینے ہی میں پکڑ لیا اور میں مجبور ہو کر ان کے ہمراہ گاؤں جا رہا ہوں۔ تم کسی قسم کا خیال نہ کرنا، میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔ ماتاجی بیمار ہیں اور اسی باعث میں کچھ دنوں کے لئے تم سے جدا ہو رہا ہوں۔ اگرچہ یہ چند روزہ جدائی میرے لئے اذیت ناک ہے، لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں، اندرا......!

صرف تمہارا ــــ کمار

خط کے ساتھ کمار نے اپنی ایک تصویر بھی بھیجی تھی اور ایک خاص پتے پر اُس نے اندرا کی تصویر منگوائی تھی۔ اندرا نے خط کے جواب کے ساتھ ہی اپنی تصویر بھی پہلی ڈاک سے بھیج دی۔

---

اندرا اب ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھڑی تھی، جہاں سے نیچے دیکھنا یا واپس جانا اپنی زندگی کو خود موت کے منہ میں دھکیلنے کے مترادف تھا۔ ایک ذرا سا اشارہ اُسے پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گرا کر اُس کے آئینۂ زندگی کو چور چور کر سکتا تھا اور اس کا باعث کمار تھا ــ صرف کمار!

کمار کے گھر سے آیا ہوا دوسرا خط کھولتے کھولتے اندرا کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کمار نے اُسے اپنے آنے کی اطلاع دی ہو گی۔ امیدوں کی ایک حسین دنیا اُس کی آنکھوں کے سامنے ناچ اٹھی مگر دوسرے ہی لمحے اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے چراغِ مسرت کو جان بوجھ کر بجھا دیا گیا ہے۔ کمار کی شادی ہو چکی تھی۔ اُس کے پتا نے اندرا کو اپنا پتی تلاش کرنے کے لئے آزاد کر دیا تھا۔ خط کے آخر میں لکھا تھا "تم نے کمار کو اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر اُس کی زندگی کو تباہ کرنے کی کوشش کی تھی جو ایک باپ کیلئے ناقابلِ برداشت تھی۔"

اندرا نے کمار کی تصویر کو بار بار دیکھا اور سوچا۔ اسی نے تو میری دنیا اجاڑی ہے۔ پھر بھی مجھے اس سے نفرت کیوں نہیں ہوتی ہے سینے کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے دل نے جواب دیا" اندرا تم عورت ہو' عورت جسے ایکبار محبت کی نگاہوں سے دیکھ لیتی ہے' اُس سے کبھی آنکھیں نہیں چراتی"

اور اُس نے کمار کی تصویر کے پیچھے لکھ دیا" میری زندگی کا سہارا"

ماں نے دیکھا اور کہا" اندرا تو کمار کے لئے پاگل کیوں ہوئی جارہی ہے۔ اچھا ہوا جو ایسے بیوفا کے ساتھ زندگی بھر کے لئے تمہیں باندھنا نہ پڑا"

مگر اندرا نے کوئی جواب نہ دیا۔

اندرا کا خیال تھا کہ والدین کے اصرار سے مجبور ہوکر کمار نے شادی کی ہے' وہ اُسے کبھی نہ بھول سکے گا۔ وہ اُسکے ذہن میں روئیں روئیں میں سمائی ہوئی ہے۔ کمار اُس سے ایک بار ضرور ملنے آئے گا۔ مگر دو سال گذر گئے' کمار نہ آیا۔ اسی دوران میں اُس کی ماں اُسے اس دنیا میں اکیلا چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئی۔ اب گانے اور رونے کے سوا اُس کا اور کوئی شغل نہ رہا۔ وہ اکیلی تھی اور تنہائی کی زندگی بسر کرنا گویا سسک سسک کے جان دینے کے مترادف ہے اور پھر ایک عورت' جوان اور خوبصورت! تنہائی کی زندگی کیوں کر بسر کرسکتی ہے؟"

لیکن اس کے باوجود خودکشی یا شادی کا خیال تک اُس کے دل میں کبھی پیدا نہ ہوا۔ وہ دریا کی سطح پر تیرتے ہوئے ایک سوکھے پتے کی طرح اپنی زندگی کے دن گذار رہی تھی کہ تین سال کے بعد ایک دن اُس نے دیکھا سامنے والی سڑک پر کمار گود میں ایک ننھا سا بچہ لئے ہوئے' اپنی بیوی کے ساتھ چلا آرہا ہے۔ دیکھتے ہی اُس کے دل میں ایک ہُوک سی اٹھی۔ اُس نے چاہا کہ

جاکر بچے کا منہ چوم لے مگر ایک خیال اُس کے دل میں جھانک کر مسکرایا۔ شاید کمار ادھر ہی آرہا ہے۔ لیکن اُس نے اُس کے مکان کو ایک نگاہ بھی تو نہیں دیکھا اور پاس کی ایک گلی میں مڑکر اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا اور وہ ایک آہ بھر کر رہ گئی۔

---

اسی طرح دنوں سے ہفتے اور ہفتوں سے مہینے گذر گئے۔ سال ختم ہوا اور نیا سال آگیا۔ مگر اندرا کے گلشن امید میں بہار نہ آئی۔ وہ اسی امید پر تو جی رہی تھی کہ کمار ایک بار اُس سے ضرور ملنے آتے گا۔ مگر انتظار کی گھڑیاں طویل ہوتی جا رہی تھیں اور ناامیدی ناسور بن کر اندر ہی اندر اُس کی زندگی کو کھوکھلا کیے دے رہی تھی۔ کھانا پینا، میل ملاقات، سیر و تفریح اور موسیقی کی تعلیم وغیرہ سے اُسے اب کوئی لگاؤ نہ رہا تھا اور اُس کی صحت بھی اُسے جواب دے چکی تھی۔ حسن و جوانی کی تمام رعنائیاں غارت ہو چکی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسے دق کا عارضہ ہوگیا ہے، اب وہ شاید ہی بچ سکے۔ موت کی حسین دیوی کے پُرفریب قہقہوں کے جُھرمٹ میں اس کی زندگی کھو جائے گی —— تلاش کرنے پر بھی نہ ملے گی ——!

وہ اپنے کمرے میں تنہا بستر مرگ پر تڑپ رہی تھی۔ اُس کے سینے میں شاید آگ کا ایک طوفان اُمڈ آیا تھا۔ پیاس کی شدت سے زبان سوکھ کر کانٹا بن گئی تھی۔ مگر اس آخری وقت میں بھی اُس کی پیاس بجھانے والا کوئی نہ تھا —— یکایک دروازہ کھلا۔ کمرے میں کمار داخل ہوا۔ اُس کا تین سال کا بچہ اُس کی گود میں تھا۔ اندرا بڑبڑا رہی تھی :-

"تم آگئے، ضرور آؤ گے"

"میں آگیا اندرا!" کمار جلدی سے بچے کو ایک کرسی پر بٹھا کر اندرا کی طرف بڑھا۔

اندرا نے آنکھیں کھول کر دیکھا، اُس کا سر کمار کے زانو پر تھا۔

"اندرا مجھے معاف کر دو میں......" وہ آگے کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ اندرا بولی: "تم ـــــ تم بڑے اچھے ہو، تم نے میری زندگی کی آخری آرزو پوری کی ہے، اب میں چین سے مر سکوں گی!"

"لیکن ـــ" کمار جلدی سے بولا: "لیکن اس بچے کو اب ماں کی ضرورت ہے، تم ہی اب اس کی ماں ہو۔"

"ماں ـــــ! ہاں ـــــ ہاں ـــــ ہاں میں اس کی ـــــ ماں ہوں ـــــ ماں! ـــــ" اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ ایک جھرجھری سی آئی اور اُس کا جسم برف سے بھی زیادہ سرد ہو گیا۔

ایک پل کے بعد کمار کی آنکھیں اندرا کے لبوں پر آنسوؤں کی بارش سے شاید اُس کی پیاس بجھا رہی تھیں۔

# کھڑکی

کمرے میں بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی، ٹیبل لیمپ کی روشنی سامنے کی بڑی میز پر پھیلی ہوئی تھی، شیڈ لگا ہوا تھا، اس لئے سارے کمرے میں اندھیرا تھا، میں اکیلا کرسی پر ہاتھ پاؤں سکیڑے بیٹھا تھا، جیسے شدت کی سردی ہو، اور اس طرح بیٹھنے میں مجھے کسی قسم کی تکلیف بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی، میرے آگے میز پر کئی کتابیں بکھری پڑی تھیں۔

اپنے کمرے کو خاص طور پر سجانے کا میرے دل میں کبھی بھی خیال پیدا نہیں ہوا تھا، البتہ ہر اتوار کو کمرے کی صفائی کرنا ضروری سمجھتا ہوں، میرا یہ کمرہ تیسری منزل پہ واقع ہے، نچلی دو منزلوں میں اور کرایہ دار بستے ہیں، میری ان سے کوئی صاحب سلامت نہیں، اور نہ ہی میں نے کبھی ان سے صاحب سلامت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، زینے پر چڑھتے اور اترتے وقت کبھی کبھی ان کی صورتیں ضرور دیکھ لیتا ہوں، اسی طرح ان لوگوں نے کبھی مجھ سے متعارف

ہونے کی کبھی کوشش نہیں کی، البتہ انہوں نے مجھے دیکھا ضرور ہوگا۔

مجھے اس کمرے میں رہتے ہوئے زیادہ سے زیادہ چھ مہینے ہوئے ہوں گے، اس بلڈنگ کے مالک ایک سیٹھ جی ہیں، وہ کچھ عجیب طبیعت کے مالک ہیں، میں جب ان کے پاس اس کمرے کو کرایہ پر لیتے گیا، تو انھوں نے کہا تھا۔

" دیکھئے جناب یہ کمرہ تیسری منزل پر واقع ہے محلّے میں سب سے اونچا مکان بھی ہے، اس لئے آپ کمرے کی کھڑکیاں نہ کھول سکیں گے، کیونکہ آس پاس کے مکانات میں بسنے والی مستورات کی بے پردگی ہوگی، اگر آپ کو یہ شرط منظور ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

اور میں نے سیٹھ جی کو اس بات کا پورا، پورا یقین دلایا تھا، کہ میں کھڑکیاں نہ کھولوں گا، چنانچہ اس وقت سے اب تک میں نے انھیں کبھی نہیں کھولا۔ لیکن، آج میرے دل میں بار بار کھڑکی کھول کر برابر والے مکان میں جھانک کر یہ دیکھنے کی خواہش پیدا ہو رہی ہے کہ اس گھر میں کتنے متنفس مقیم ہیں، کتنی عورتیں مقیم ہیں، کتنے مرد ہیں، اور کتنی لڑکیاں!

میں نے سوچا، کہ پڑوس کے اس گھر میں عورتیں بھی ہوں گی اور لڑکیاں بھی! مردوں کو اس کی قطعی اجازت نہیں ہے، کہ وہ دوسروں کی عورتوں اور لڑکیوں کو دیکھیں ابتدائے آفرینش سے ہی ان عورتوں اور لڑکیوں کو دوسرے مردوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھا جاتا ہے۔ گھر کی چہار دیواری میں انھیں قید کر کے رکھنا بیحد ضروری سمجھا جاتا ہے شاید اسی لئے مجھ سے یہ وعدہ لیا گیا تھا، کہ میں کھڑکیاں نہ کھولوں ممکن ہے کھڑکیاں کھولنے پر اس مکان کی عورتیں میری آنکھوں کے سامنے آجائیں، اور میں انھیں دیکھ لوں۔

مگر مجھے عورتوں کو پردہ میں رکھنا ہرگز ہرگز پسند نہیں، غیر مرد کا کسی عورت کو دیکھ لینا میرے نزدیک کوئی گناہ نہیں، گلشن میں اگر پھولوں پر پردہ ڈال دیا جائے اور صرف بغیر ثمر و گل کے درخت، جھاڑیاں، پودے اور گھاس ہی نظر آئے تو اُسے گلشن کہنا میرے نزدیک حماقت ہے، یہ دنیا بھی تو گلشن ہے، قدرت نے اس میں بھی پھول، کلیاں، پودے، درخت اور جھاڑیاں پیدا کی ہیں، اس دنیا میں عورتیں پھول ہیں، تو لڑکیاں کلیاں! لڑکے پودے ہیں تو مرد درخت ہیں، پھر ان کلیوں اور پھولوں کو پردے میں رکھ کر اس دنیا کو بے رونق بنایا جائے، تو کیوں؟ کیا یہ حماقت نہیں؟ سراسر حماقت ہے اِنھیں دنیا کی رنگینیوں سے دور ــــ بہت دور رکھ کر ہم انھیں اپنا آپ پہچاننے کا آخر موقع کیوں نہیں دیتے؟ ساہوکار اپنی پونجی کو زمین میں چھپا دیتا ہے، اس کی حفاظت کرتا ہے، ٹھیک اسی طرح مرد عورت کو پونجی سمجھ کر دوسروں کی نگاہوں سے چھپاتا پھرتا ہے، آخر کیوں؟ کس لئے؟ عورت کو پونجی سمجھنا کیا بے انصافی نہیں ہے؟ گھر کی چہار دیواری میں اسے قید کر کے رکھنا، اسے ناقابلِ اعتبار سمجھنا کیا بے انصافی نہیں ہے؟ ایک طرف تو کہا جاتا ہے کہ عورت لکشمی ہے، وفا کی دیوی ہے، عورت یہ ہے، عورت وہ ہے، اور دوسری طرف اُسے پونجی سمجھ کر اس کی حفاظت کی جاتی ہے، اسے ناقابلِ اعتبار سمجھا جاتا ہے، اور اسے دنیا کی رنگینیوں سے دور رکھ کر اسے اپنے آپ کو سمجھنے اور پہچاننے کا موقع نہیں دیا جاتا، کیوں؟ آخر کیوں؟

میں عورت کو نہ تو دیوی سمجھتا ہوں اور نہ ہی اسے کسی اور روپ میں دیکھتا ہوں، میں عورت کی جسمانی ساخت کو حد درجہ جاذب اور دلفریب

دیکھنا پسند کرتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ وہ آنا دینا کر آخری سانس تک مرد کے لئے جاذب نظر اور دلفریب بنی رہے، اس کی رگوں میں خون ہو، اسکے دل میں ارمان ہوں اور اس کی آنکھوں میں مقناطیسی کشش ہو، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہو، اور جسم میں گداز پن!

عورت کا یہ دلفریب نقشہ ہر لمحہ اور ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے، لیکن آج تو میری آنکھوں کے سامنے صبح ہی سے پسیاں ناچ رہی ہیں، عورت کی جوانی اور خوبصورتی ایک بلا کی حسین عورت کے روپ میں آنکھوں کی راہ سے دل میں اتر آئی ہے، دل کے آئینہ پر اس سے پہلے عورت کی صحیح تصویر کا عکس میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا، میں عورت کو اپنے دل میں چھپا کر اس کے حسن و شباب کی رعنائیوں میں کھو جانے کی خواہش محسوس کر رہا ہوں۔

میں نے سوچا، پڑوس کے مکان میں ضرور کوئی نہ کوئی عورت ہو گی، اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں جوانی کا خمار ہو گا، کشمیر کے سیب کی مانند اسکے لال لال رخسار ہوں گے، اس کی لانبی لانبی زلفیں ہوں گی اور جب وہ سیدھی کھڑی ہوتی ہو گی، تو بہت پیاری، بہت خوبصورت اور بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہو گی، سننے میں بہت ہی بھلا اس کا چھوٹا سا نام ہو گا۔ آجکل لوگ مختصر نام بہت پسند کرتے ہیں، اس کا نام کیا ہو سکتا ہے، کیا ہو گا اس کا نام؟ میں سوچنے لگا، کئی لڑکیوں کے نام ذہن میں آتے، اور کئی لڑکیوں کی دلفریب صورتیں بھی میری آنکھوں میں پھر گئیں، میں نے سوچا، اس کا نام اندرا ہو گا، لیکن تارا نام بھی تو برا نہیں ہے، شاید اسے لوگ تارا کہہ کر پکارتے ہوں! سب کچھ ہو سکتا ہے، لیکن مجھے یہ نام پسند نہیں ہیں مجھے راگنی نام

بہت پسند ہے، میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا، کہ اس لڑکی کا نام یقیناً راگنی ہوگا ـــــ راگنی!

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ بیکار بیٹھے بیٹھے میں نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر بہت سی لڑکیوں کے سنے ہوئے نام لکھے تھے۔ ان ناموں میں سے نہ جانے کیوں مجھے راگنی نام پسند آگیا، میں نے آہستہ آہستہ اس نام کو کئی مرتبہ دل ہی دل میں دہرایا ـــــ راگنی...... راگنی! اس نام کو دہراتے ہوتے مجھے اپنے جسم میں گدی گدی سی محسوس ہوئی، اور مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے میرے جلتے ہوئے کلیجہ پر کسی نے برف کا ٹکڑا رکھ دیا ہو، اور اس کے ساتھ ہی میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ میرے دل کا تمام خون دماغ کی طرف دوڑ رہا ہے، میری آنکھوں میں راگنی کی تصویر ناچنے لگی، جیسے میرے قریب کھڑا کوئی سانس لے رہا ہے اس کے سانس لینے کی آواز میرے کانوں میں آرہی تھی، لیکن یہاں آخر کون آسکتا تھا؟ بہت دنوں سے میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی، کہ میں کسی خوبصورت اور جوان عورت کو اپنے دل میں جگہ دوں، سوچا شاید آج پوری ہو جائے کاش راگنی یہاں آسکتی!

اسی وقت اچانک کئی لڑکیوں کا خیال میرے دل میں پیدا ہوا، اور ان کی باتیں یاد آگئیں، آج سے دو سال پہلے کا ایک واقعہ جو ذہن سے اتر چکا تھا، یاد آگیا، صبح کالج میں داخل ہوتے ہی کالج کی سڑک پر میں ہر روز ایک لڑکی کو آتے جاتے دیکھتا تھا، وہ لڑکی رنگ روپ کے لحاظ سے بہت دلکش تھی، کالج کے بہت سے لڑکے اسے آرزومندانہ نگاہوں سے دیکھتے تھے، میرے دل میں بھی اس سے بات چیت کرنے کی خواہش

پیدا ہوئی، لیکن کوئی ایسی تدبیر ذہن میں نہیں آتی تھی، بارہا اکثر ایسا ہوا کہ میری سائیکل اس کی بغل سے گذری، اور میں نے سوچا بس یہیں پر سائیکل روک کر اس سے دو باتیں کر لوں، مگر ہمت نہ ہوئی، سوچا اگر وہ نہ رکی ......؟

اور ہاں مجھے اس کا نام بھی تو معلوم نہ تھا، بڑی کوشش کے بعد مجھے اس کا نام معلوم ہوا، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اس سے باتیں کرنے کیلئے میں اس قدر بیقرار کیوں ہوں، اس کا نام راگنی تھا اور وہ کالج کے پاس ہی ایک کوٹھی میں اپنے والدین کے ساتھ رہتی تھی، میں ہر روز صبح و شام اس کی کوٹھی کے کئی کئی چکر لگاتا، لیکن وہ نظر نہ آتی۔

آخر ایک دن اس سے ملنے کی ایک تدبیر ذہن میں آئی، میں نے اسکے پتا کو ایک خط لکھا، کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں، ان کا جواب آیا، اس کے پتا کا جواب پاکر مجھے بہت خوشی ہوئی، خط کی تحریر سے معلوم ہوتا تھا، کہ وہ راگنی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اور دستخط اُس کے پتا نے کئے ہیں، میں اسی دن شام کو اُن سے ملنے چلا گیا پہلے تو کچھ تعارفی باتیں ہوئیں، پھر بہت دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، آخر میں شعر و شاعری کا تذکرہ شروع ہو گیا، اس کے پتا جی کو غالب کی شاعری سے بہت لگاؤ تھا، انھوں نے غالب کے بہت سے چیدہ چیدہ اشعار یاد کر رکھے تھے، شعر و شاعری کے تذکرے کے شروع ہوتے ہی انھوں نے غالب کے اشعار سنانا شروع کر دیئے، اس دن راگنی کو میں نے بہت قریب سے دیکھا، دو گھنٹے تک یہ سلسلہ جاری رہا، راگنی وہیں بیٹھی رہی، میں نے کئی بار اس کی طرف دیکھا، وہ سمجھ گئی کہ میں اُسے دیکھنے کے لئے ہی یہاں آیا ہوں، لڑکیاں بہت ہوشیار ہوتی ہیں، وہ سب کچھ سمجھ جانے پر بھی ناسمجھ بنی

رہتی ہیں، میں نے اس سے بھی تیز کیں۔ راگنی سے ........ باتیں کرنے میں مجھے جتنی مسرت حاصل ہوئی میں بیان نہیں کر سکتا، وہ بہت سمجھ دار تھی، اور لڑکوں کو اچھی طرح سمجھتی تھی، وہ جانتی تھی کہ لڑکیوں سے بات چیت کرنے کیلئے لڑکے کیسے کیسے ڈھونگ رچاتے ہیں، اور کون کون سے طریقے اختیار کرتے ہیں۔

آہستہ آہستہ میں اس کے بارے میں سب کچھ جان گیا، میں اس سے گھنٹوں باتیں کرتا تھا، اس کے والدین نے بھی ہمارا ہر روز کا ملنا کبھی معیوب خیال نہیں کیا تھا، اس لئے ہم دونوں آزادانہ طور پر ملتے تھے، کچھ مہینوں کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ راگنی کی نسبت طے ہو چکی ہے، اور موسم سرما کے آغاز میں اس کی شادی ہو جائے گی، سنتے ہی مجھ پر جیسے بجلی گر پڑی نہ جانے کیوں ......؟ اور میں کوشش کے باوجود یہ نہ سمجھ سکا کہ کسی دوسرے کے ساتھ اس کی شادی ہونے کی خبر سن کر میں اپنے دل میں تکلیف سی کیوں محسوس کر رہا ہوں؟ کہیں نہ کہیں تو آخر اس کی شادی ہو گی، اس کے والدین تمام عمر تو گھر میں بٹھانے سے رہے ـــــ آخر شادی کا دن آپہنچا، بارات کے خیر مقدم اور خاطر تواضع کے لئے خوب اہتمام کیا گیا، راگنی کی سہیلیوں نے اسے خوب سجا بنا کر فتنۂ قیامت بنا دیا، میں بھی اسے دیکھنے گیا مگر دلہن کے لباس میں وہ مجھے قطعاً بھلی معلوم نہ ہوئی اور مجھے راگنی پر حیرت ہوئی کہ اس نے اس طرح گڑیوں کی طرح بننا سنورنا کیسے منظور کر لیا۔

میں چلا آیا، اور اس وقت سے آج تک میں نے اسے پھر کبھی نہیں دیکھا، سوچا کہ پتی کی گود میں سمٹ کر اس نے اپنے آپ کو اسے سونپ دیا ہو گا اور اس کے پتی نے اس کے جسم کے ساتھ من مانا کھیل کھیلا ہو گا، کیا اس نے کبھی کوئی غدر کیا ہو گا؟ شاید نہیں، کیا آج بھی وہ اتنی ہی خوبصورت ہو گی،

جتنی آج سے دو سال پہلے تھی' خوبصورت چاہے وہ اب بھی ہو مگر اب اسمیں پہلی سی وہ جاذبیت اور رعنائی نہ ہوگی' شادی کے بعد لڑکیاں اپنے جسم کی مطلقاً پرواہ نہیں کرتیں۔

راگنی کی یاد نے آج میرے دل میں ایک درد سا پیدا کر دیا' دو برس پہلے کی راگنی میری آنکھوں کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی' پھر راستے میں' پارک میں' ٹرین میں دیکھی ہوئی کئی لڑکیوں کی یاد دل میں چٹکیاں لینے لگی' ان کی دلفریب صورتیں ایک ایک کرکے آنکھوں کے سامنے آئیں' اور اوجھل ہوگئیں' جی چاہا' ان میں سے کسی ایک کو......!'

پھر یکایک جیسے کسی نے میرے کان میں آہستہ سے کہہ دیا' کیوں ایک لڑکی کی زندگی کو تباہ کرنے کے متعلق سوچ رہے ہو؟ یہ گناہ ہے۔ گناہ!

اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا' جیسے میرے جسم کی تمام رگیں سکڑ رہی ہیں' دل زور' زور سے دھڑکنے لگا' ہاتھ پاؤں کانپنے لگے' میں اور بھی سمٹ کر بیٹھ گیا۔۔۔۔ بیٹھ گیا اور بہت دیر تک بیٹھا رہا' پھر آہستہ سے اٹھ کر میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھول دی' سامنے کے کمرے میں نیلے بلب کی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور.... ایک عورت اور ایک مرد پلنگ پر ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔

عورت اور مرد۔۔۔۔ اس کے آگے میں کچھ نہیں سوچ سکا۔۔۔۔ کچھ بھی نہیں! دوسرے دن میں نے وہ کمرہ خالی کر دیا۔

# محبت کی اذیت

"پکچر ہاؤس" میں نیو تھیٹرز کا "دیوداس" دکھایا جا رہا تھا۔ لیفٹیننٹ اور اس کے ساتھی پہلے ہی سے فرسٹ کلاس میں جا بیٹھے تھے۔ ایک صاحب دو عورتوں کے ساتھ آ کر سامنے کی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک عورت تو ادھیڑ عمر کی تھی اور دوسری خوبصورت اور جوان سال! اُس کا حسن متبسّم اور شبابِ خنداں لیفٹیننٹ کی نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ اُسے بہت بھلی معلوم ہوئی اور وہ کچھ شرارت کرنے کی سوچنے لگا۔ ایک بار اپنے کوٹ کے کالر سے پن نکالی، پھر ویسے ہی لگالی نہ جانے کیوں؟ آج اُسکی شریر طبیعت کو کوئی شرارت نہ سوجھ سکی۔ وہ بس اُس کی طرف دیکھتا ہی رہا۔ فلم ختم ہونے سے پہلے اُس نے اپنی جیب سے ایک بہت ہی بڑھیا ریشمی رومال نکال کر اُس لڑکی کی ساری کے اُلٹے پلّو سے اس صفائی سے باندھ دیا کہ نہ تو اس کے ساتھیوں کو اس کا علم ہوا اور نہ اس لڑکی کو!

فلم ختم ہونے پر جب سب لوگ باہر نکلے تو اُس لڑکی کے ساتھی مرد نے اُسے گھڑک کر کہا "یہ کونسا فیشن ہے؟ پیچھے رومال باندھنے کا؟"

"کہاں؟" لڑکی نے چونک کر پوچھا اور اُس نے دیکھا کہ ایک بہت ہی بڑھیا ریشمی رومال اس کی ساری کے پلّو سے بندھا ہوا لٹک رہا ہے۔ اُس نے جلدی سے اُسے کھولا اور وہ کہنا ہی چاہتی تھی کہ یہ اُس نے خود نہیں باندھا بلکہ کسی نے اُس کے ساتھ شرارت کی ہے۔ لیکن یہ سوچ کر کہ یہ سنتے ہی اُس کے پتا خواہ مخواہ کسی سے جھگڑا نہ مول لے لیں، اُس نے چپکے سے رومال ہاتھ کی مٹھی میں دبالیا۔

یشونت نے لڑکی کے چہرے پر گھبراہٹ دیکھی اور ہنستا ہوا وہاں سے چلا آیا۔ کچھ دنوں تک تو وہ اُس لڑکی کو بھول نہ سکا۔ لیکن وقت سب کچھ بھلا دیتا ہے۔

---

نوین اور یشونت دونوں بہت گہرے دوست تھے۔ دور دور مکان ہونے پر بھی دونوں دن کے سولہ گھنٹے اکٹھے رہ کر پڑھتے، کھیلتے اور کھاتے پیتے تھے۔ نوین اگر چاہتا تو کالج میں بھی داخل ہوسکتا تھا۔ لیکن اُس نے اپنی تعلیم میٹرک تک پہنچ کر ہی ختم کر دی۔ اور یشونت اسکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی میں پہنچ گیا۔ نوین کا شروع ہی سے موسیقی کی طرف رجحان تھا۔ اس لئے اُس نے خود کو ایک ماہر موسیقی کے سپرد کر دیا۔ نوین اور یشونت جو بچپن ہی سے ایک راستے پر چل رہے تھے علیحدہ علیحدہ راستے پر چلنے لگے اور دونوں کو ایک دوسرے سے ملنے کا بہت ہی کم وقت ملنے لگا۔ رفتہ رفتہ وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت دور ہو گئے۔ مگر کبھی کبھار وہ ملتے تو پرانی دوستی کی یاد

پھر سے تازہ ہو جاتی اور وہ گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے۔

نوین کی شادی ہو تو یہ ناممکن ہے کہ لیشونت شریک نہ ہو۔ نوین کی شادی کی جس قدر خوشی اُسے ہوئی شاید اتنی نوین کو بھی نہ ہوئی ہو۔ بھابی کے گھر آجانے پر لیشونت اس کے قریب جاکر بولا" ہٹاؤ بھی' یہ گھونگھٹ کیسا، ہم کوئی غیر ہیں۔ ہم تو تمہارے دیور ہیں۔"

بھابی پڑھی لکھی تھی اور پردے کی مخالف بھی۔ اُس نے منہ کھول کر مسکراتے ہوئے کہا" دیور ہو تو پیر چھوؤ۔"

لیشونت مسکراتا ہوا پیر چھونے کے لئے آگے بڑھا اور یہ کہہ کر "یہ لو" اُس نے بھابی کے پیر چھونے کے لئے اپنے ہاتھ بڑھائے لیکن اُس کی نگاہوں نے بھابی کے چہرے کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھی اور اُس کے ہاتھ وہیں رُک گئے۔ کچھ حیرت زدہ سا ہو کر بولا" نہیں۔"

"نہیں...... یہ کیا کہہ رہے ہو" بھابی بولی" دیور بھی بنتے ہو اور پیر بھی نہیں چھوتے۔"

"ہاں' تمہارے پیر نہ چھو سکوں گا" یہ کہہ کر لیشونت چلنے کے لئے دروازے کی طرف بڑھا۔ بھابی کے لئے جو تحفہ وہ لایا تھا۔ اُس کی جیب ہی میں پڑا رہا۔

"آخر کیوں؟" بھابی نے حیرت سے پوچھا۔

"ایسے ہی" اُس نے کہا اور پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوا بولا" میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے بھابی؟"

"مجھے؟" بھابی گہری سوچ میں پڑ گئی اور لیشونت بھی سوچتا چلا گیا۔

---

لیشونت نوین کے یہاں پھر آنے جانے لگا۔ پُرانی دوستی پھر سے تازہ ہوگئی۔ لیشونت، نوین کے پاس بیٹھا اُن گذرے ہوئے دنوں کی باتیں کرتا جب وہ دونوں یک جان دو قالب تھے۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہی تھی۔ لیشونت دنیا کو دھوکا دے سکتا تھا لیکن اپنے آپ کو دھوکا دینے میں کیوں کر کامیاب ہو سکتا تھا نوین کی بیوی سربتا اُس کے دل ودماغ پہ چھائی ہوئی تھی۔

سربتا اپنے باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بچپن سے ہی اُس نے جو چاہا وہی ملا۔ لیکن، جوانی میں اُس کے دل نے ایک آرزو، ایک تمنا، ایک خواہش محسوس کی۔ اُس کے تخیل نے اندر ہی اندر اُس کے پتی کا ایک مجسمہ تعمیر کیا اور وہ اُسی وقت سے اُس کی پجارن، اُس کے چرنوں کی داسی بن گئی۔ یوں تو نوین خوبصورت تھا اتنا خوبصورت کہ اُسے سینکڑوں میں ایک کہا جا سکے۔ لیکن شاید سربتا اُسکی خوبصورتی کے فریب میں آگئی تھی اور اُس رشتے کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہ کر سکی تھی۔ یہ تو اُس سے شادی کے بعد ہی محسوس کیا تھا کہ اُس کے اور اُسکے پتی کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

نوین کو کتابوں سے کچھ اس قدر نفرت سی ہوگئی تھی کہ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد شاید ہی اُس نے کبھی کسی کتاب کو چھوا ہو لیکن سربتا! کتابوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ نوین کا دماغ ہر وقت، ہر لمحہ نئے گانوں اور نئی نئی طرزوں کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا۔ وہ موسیقی کا دلدادہ تھا۔ اور سربتا کو اس سے نفرت تھی۔ حالانکہ وہ خود بھی بہت اچھا گا سکتی تھی۔ لیکن دق کی طرح اس سے ہر وقت، ہر لمحہ چپکے رہنا اُسے کسی قیمت پر بھی منظور نہ تھا اور اس اختلاف نے نوین اور سربتا کے درمیان محبت کی اُن بینگوں کے پڑنے

میں ایک رکاوٹ پیدا کر دی تھی جو شادی کے بعد ان دونوں کے درمیان پڑنی چاہیئے نہیں۔

سریتا کے اکثر و بیشتر لمحات تنہائی میں گذرتے تھے۔ صبح و شام جب وہ اپنی پڑوسنوں کو اپنے شوہروں کے ہمراہ سیر کے لئے جاتے دیکھتی تو سینہ مسوس کر رہ جاتی۔ ایک دن شام کو وہ اپنے کمرے میں بالکل تنہا بیٹھی تھی۔ نوین شاہجہان پکچرز کے نئے فلم کی ریہرسل کرانے گیا ہوا تھا۔ یکایک اُس کے دل میں نوین کے خلاف یہ خیال پیدا ہوا کہ موسیقی کی تعلیم دینا تو محض اُس کا بہانہ ہے وہ ضرور کسی ایکٹرس کی شمع حسن کا پروانہ ہے اُس کی محبت اُسے دیوانہ وار وہاں لے جاتی ہے اور اُس کے اس خیال نے اندر ہی اندر یقین کی صورت اختیار کر لی۔ عین اسی وقت لیشونت داخل ہوا۔ لیکن سریتا کو اُس کی آمد کی مطلق خبر نہ ہوئی وہ بیٹھی بیٹھی کڑھ رہی تھی۔

"بھابی!"

سریتا نے چونک کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ لیشونت مسکراتا ہوا اُس کے قریب آگیا اور پاس ہی ایک کرسی پر بیٹھ کر سریتا کو گہری نظروں سے دیکھتا ہوا بولا "بھابی خیریت تو ہے! تمہاری پیشانی پر یہ آڑی ترچھی ریکھائیں کیسی؟ میں تو یہاں اس خیال سے آیا تھا کہ نوین سے کچھ دیر گپ شپ ہی رہے گی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نوین گھر پر موجود نہیں ہے۔ اسی کی جدائی کے غم سے تمہاری صورت بھی تو مرجھائی مرجھائی سی ہو رہی ہے۔"

اور سریتا کی آنکھوں کی پتلیاں جیسے پتھر ہو گئی تھیں۔ وہ ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کتنا اچھا ہے لیشونت! اس کے آتے ہی جیسے کمرے کا سب گرد و غبار صاف ہو گیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ایک

تازگی سی اپنے ساتھ لے کر آیا ہے۔

"کیا ہم سے نہ بولو گی' نہ بولو' اچھا تو ہم چلے"۔ کہہ کر یشونت کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ کی ہر بات لاجواب ہوتی ہے"۔ سریتا مسکرا کر بولی "آپ سے کیوں نہ بولوں گی ...... آخر میں ...."

"چلو تمہارا محرم تو ختم ہوا" یشونت کہتا ہوا ہنس پڑا۔ پھر بولا "بڑی دیر میں تمہارے منہ پر رونق آئی ہے ورنہ ابھی تک تو اداسی ہی اداسی چھائی ہوئی تھی"

سریتا پھر ہنس پڑی۔

"خوب باتیں بنا آتی ہیں آپ کو؟"

"آپ .... آپ .... آپ' میں تمہارا جیٹھ تھوڑے ہی ہوں بھابی .... کیا تم لفظ "آپ" میں دوری محسوس نہیں کرتیں؟"

"محسوس تو کرتی ہوں' لیکن ....." کہہ کر سریتا مسکرائی "لیکن اسکے باوجود میں تمہارے لئے اس کا استعمال ضروری سمجھتی ہوں"

"اس لئے کہ میں تمہارا حقیقی دیور نہیں"

"نہیں یہ بات نہیں"

"پھر؟"

"مجھے آپ سے ڈر لگتا ہے"۔ کہہ کر سریتا مسکرا دی۔

"آخر کونسی برائی ہے مجھ میں؟"

"یوں کہئے آخر ایسی کونسی برائی ہے ہم لوگوں میں؟"

"چلو یونہی سہی"

"عورت کے دشمن ہو تم لوگ۔ اس کے دل کو تم بغیر سوچے سمجھے کچل

دیتے ہو۔"

"لیکن مجھ سے اس قسم کا اندیشہ رکھنا کچھ بے معنی سا معلوم ہوتا ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"کیونکہ نہ تو تم مجھے دل دے سکتی ہو اور نہ میں جیسے... کیا کہوں آگے۔"

"آپ کو شکست دینا آسان نہیں ہے" کہہ کر سریتا ہنسنے لگی "اچھا لائیے، دیکھوں تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟"

لیشونت کے ہاتھ میں افسانوں کی ایک کتاب تھی وہ اُس نے سریتا کی طرف بڑھا دی۔ سریتا کتاب کے اوراق الٹنے لگی۔ ایک افسانہ پر اُس کی نگاہیں جم کر رہ گئیں۔

"یہ لیشونت کمار کون ہیں؟"

"آپ کا سیوک!" لیشونت نے کہا۔

سریتا وہ افسانہ پڑھنے لگی۔

"اور میں بیٹھا تمہارا منہ دیکھتا رہوں؟" لیشونت نے کہا۔

"کیوں کیا برا سودا ہے؟"

"گھاٹا نہ سہی، لیکن خاموشی سے میرا جی گھبراتا ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے تم اچھائی اور برائی سے اچھی طرح واقف ہو۔"

سریتا نے افسانہ پڑھ کر کتاب رکھ دی۔

"کیوں کیسا ہے یہ افسانہ؟" لیشونت نے پوچھا۔

"بہت اچھا، اگر کمزوری ہے تو وہی جو..."

"کیا؟"

"تم لوگ عورت کی دل کی گہرائی میں نہیں اتر سکتے۔ اُس کے جذبات

کو نہیں سمجھ سکتے اور جو کچھ لکھتے ہو بلا سوچے سمجھے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو، لیکن تم عورتیں بھی تو ایک معمہ بنی رہنا چاہتی ہو۔ جب ہم لوگوں کے سامنے تم اپنا ہردے کھولنا ہی نہیں چاہتیں تو ہم تمہارے متعلق کیونکر جان سکتے ہیں۔ بس تخیل جو کچھ لکھواتا ہے لکھ دیتے ہیں۔ میں اگر تم سے ہی پوچھوں کہ بتاؤ تم نے کبھی کسی سے پریم کیا ہے تو تم نہیں نہیں کہہ کر "ستی پاربتی" بن جاؤ گی۔"

"اور تم یقین کر لو گے کہ میں ستی پاربتی ہوں۔"

"یقین کرنے کی بات نہیں ہے۔ یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ دنیا میں شاید ہی ایسے مرد عورت ہوں گے۔ جنہوں نے کبھی کسی سے محبت نہ کی ہو گی۔ حالانکہ محبت کبھی چھپ نہیں سکتی، لیکن پھر بھی اسے چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دونوں اپنے اپنے جذبات ہمیشہ تیسرے سے پوشیدہ رکھتے ہیں۔ اس صورت میں، ہم کسی کے جذبات کو کیونکر سمجھ سکتے ہیں، جبکہ ہمیں اس سے واسطہ ہی نہ پڑا ہو۔"

"کیا بتاؤں، میں نے کبھی کسی سے محبت کی ہوتی تو یقین مانو میں آپ کو ضرور بتا دیتی، لیشونت بابو! مجھے افسوس ہے کہ اس سلسلے میں میں آپ کی کوئی امداد نہیں کر سکتی۔"

"میں یہ کبھی نہیں مان سکتا۔ کہ کسی کی صورت تمہاری آنکھوں کے راستے تمہارے دل میں نہ اتری ہو اور تم نے اُس کے متعلق کبھی کچھ سوچا بھی نہ ہو۔"

"اچھا، اگر آپ اتنی سی بات ہی کو محبت تصور کر کے مطمئن ہو سکتے ہیں تو سنئے: شادی سے پہلے مجھے ایک نوجوان سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ وہ کون تھا؟ یہ میں نہیں جانتی۔ سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ میں نے اُس کی صورت بھی نہیں دیکھی لیکن اس کے باوجود میرے دل میں اُس کے لئے محبت تھی۔ ایک

مرتبہ میں اپنے ماتا پتا کے ساتھ سنیما دیکھنے گئی پچھلی سیٹوں پہ کالج کے کچھ نوجوان بیٹھے اپنی عادت کے مطابق "ہلڑ" مچا رہے تھے۔ میں نے جان بوجھ کر پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا اور جب فلم ختم ہوا اور میں باہر نکلی تو پتاجی کی ڈانٹ سنی "یہ پیچھے رومال باندھنے کا کونسا فیشن ہے؟" میں گھبرا گئی گھوم کر دیکھتی ہوں تو ساری کے الٹے پلو سے ایک بہت ہی بڑھیا ریشمی رومال بندھا ہوا ہے۔ میں فوراً بھانپ گئی کہ یہ کالج کے انہیں شریر لڑکوں میں سے کسی ایک کی شرارت ہے، لیکن میں نے پتاجی سے کچھ نہ کہا۔ کیونکہ وہ ذرا تیز طبیعت کے واقع ہوتے ہیں۔ وہ ضرور کسی نہ کسی سے لڑ پڑتے۔ چنانچہ خاموشی سے رومال کھول کر مٹھی میں دبا لیا۔ رومال باندھنے والے پر مجھے غصہ تو بہت آیا۔ لیکن آخر کر ہی کیا سکتی تھی۔ چپ چاپ پتاجی کے ساتھ چلی آئی۔ مگر میرا دل اس انوکھی الجھن میں الجھے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے سوچا کہ رومال باندھنے والے کو میں ضرور کچھ بھلی معلوم ہوئی ہوں تبھی تو اس نے اتنا قیمتی رومال بطور نشانی میری نذر کر دیا۔ مگر آخر وہ ہے کون؟ میرے دل میں اسے ایک نظر دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا مگر من مار کے بیٹھ رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا تاہم اس واقعے کو میں بھول نہ سکی۔ مختلف چہرے میری نگاہوں میں پھرنے لگے اور میں اس خیال کی اسیر ہو کر رہ گئی۔ کہ آخر وہ ہے کون؟ کیا میں اسے کبھی دیکھ سکوں گی؟ چنانچہ کافی عرصے تک میں اس انتظار میں رہی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رومال باندھنے والے نے میرے ساتھ مذاق کیا تھا۔ صرف مذاق! اگر اسے مجھ سے پریم ہوتا تو وہ مجھ سے ملنے کی ضرور کوشش کرتا اور یہی سوچ کر میں اس کو بھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ اب بھی جب کبھی اس واقعے کا خیال آجاتا ہے تو گھنٹوں سوچتی رہتی ہوں کہ آخر وہ کون ہے؟ یہ ہے میرا پریم! جو ایک خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اب تو آپ کو شکایت نہیں کہ ہم لوگ آپ کے سامنے اپنا

ہر دے نہیں کھولتے .....،

لیفٹیننٹ کیا کہتا۔ آج سے دو سال پہلے کا واقعہ اُس کی آنکھوں کے سامنے آگیا اور وہ دل ہی دل میں افسوس کرنے لگا کہ وہ پہلی ہی نظر میں سریتا کو پہچان کیوں نہ سکا۔ حالانکہ سریتا نے ابھی ابھی اُس کے سامنے رومال باندھنے والے کی محبت کا اعتراف کیا تھا لیکن وہ اس سلسلے میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ افسردہ سا ہو کر اُس نے کہا: "بھابی ایک بات تم سے کہوں، رومال باندھنے والے نے تمہاری ساری نے پلو سے محض شرارت کے طور پر رومال باندھا ہوگا۔ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ شرارت کرنے کے بعد اپنے کئے پر ضرور نادم ہوا ہوگا۔"

اتنا کہہ کر وہ اُٹھ کر چل دیا۔ سریتا اُس کے ساتھ ساتھ دروازے تک آ آئی۔

"آپ ایسا وثوق کے ساتھ کیونکر کہہ سکتے ہیں؟"

"اگر آپ کا دعویٰ ہے کہ مرد عورت کے دل کو نہیں سمجھ سکتے تو مجھے بھی دعویٰ ہے کہ مردوں کے دل کی بات مرد ہی جان سکتے ہیں عورتیں نہیں۔"

---

لیفٹیننٹ اب روزانہ نوین کے گھر آتا تھا۔ لیکن وہ جب بھی آتا نوین گھر پر موجود نہ ہوتا۔ اور اگر کبھی موجود بھی ہوتا تو سریتا اور وہ، دونوں اُس کے سامنے بیٹھ کر گھنٹوں ہنستے بولتے اور کبھی لارنس کی سیر کو گھر سے بے خوف و خطر نکل جاتے۔ نوین کی غیر حاضری میں بھی اکثر ایسا ہوتا۔ لیکن اس بارے میں نہ تو نوین کو کوئی اعتراض تھا اور نہ اُس کے عزیز و اقارب کو۔ کیونکہ وہ سب بہت آزاد خیال واقع ہوتے تھے۔ وہ سوچتے تھے کہ سریتا بھی آخر کب تک اکیلی بیٹھ سکتی ہے۔ نوین کو اپنے کاموں سے فرصت نہ ملتی تھی۔

رفتہ رفتہ لیشونت اور سریتا، دونوں کے درمیان تعلقات کچھ اس قدر بڑھ گئے کہ اُن کے دلوں میں بے تکلفی نے جگہ لے لی۔ ہنسنے اور بولنے کے ساتھ ساتھ آپس میں کچھ کچھ مذاق بھی ہونے لگا اور اس کا نوین کو بھی علم تھا اس بارے میں نہ جانے اس کا کیا خیال تھا۔ اچھا یا بُرا، اِس کا اُس نے کبھی اظہار نہیں کیا۔ انہی دنوں کلکتے کی ایک فلم کمپنی سے اُس کا معاہدہ ہو گیا اور وہ کلکتے جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔

لیکن نوین کے کلکتے جانے کے متعلق سن کر سریتا کچھ اُداس سی ہو گئی۔ نوین نے سمجھایا کہ اُس کے جانے سے اُسے اس قدر دکھی نہیں ہونا چاہیئے۔ محبت دور رہ کر بھی ہو سکتی ہے۔ میں لیشونت کو کہے دیتا ہوں کہ میرے جانے کے بعد وہ تمہارا خیال رکھے اور تمہارا دل بہلاتے۔

جس وقت نوین نے سریتا سے یہ کہا۔ نہ جانے اُس کے دل میں خیال کیوں پیدا ہو گیا کہ اس کے چہرے کے تاثرات کو پڑھ کر یہ اندازہ کرے کہ کہیں اُس کے دل میں اُس کے متعلق کوئی شبہ تو نہیں اور اُس نے نوین کے چہرے کو غور سے دیکھا لیکن نوین کا چہرہ اطمینان و مسرت کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔

نوین کلکتے چلا گیا۔

---

روزمرہ کے معمول کے مطابق لیشونت اور سریتا اُس شام کو بھی کھانے سے فارغ ہو کر لارنس کی سیر کو گئے۔ موسم خوشگوار تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ چاندنی دھوپ کی طرح کھل رہی تھی۔ دونوں شاداں و فرحاں ہری ہری مخملیں گھاس کو روندتے ہوئے خراماں خراماں پھر رہے تھے۔ پھرتے پھرتے "شملہ پہاڑی" کی طرف نکل گئے۔ لیشونت نے کہا "بھابی! اگر میں دوڑوں تو تم

مجھے پکڑ سکتی ہو؟"

"یہ تو دوڑنے ہی سے معلوم ہو سکتا ہے۔"

"تو میں بھاگوں، تم پکڑو گی؟"

"نہیں میں بھاگتی ہوں، تم پکڑو۔"

دوڑ شروع ہو گئی۔ سریتا دوڑنے میں بہت تیز نکلی۔ یوں تو لشونت بھی دوڑنے میں کافی تیز تھا۔ مگر چونکہ اس کا بدن کسرتی تھا، پٹھوں نے پاؤں بھاری کر دیئے تھے۔ ہرنی کی طرح بھاگتی ہوئی سریتا کو دیکھ کر لشونت کو جلد ہی یہ پتہ چل گیا کہ وہ سریتا کو پکڑنے میں ناکام رہے گا۔ لیکن پھر بھی اُس نے ہار نہ مانی۔ بھاگتا ہی رہا۔ ایک بار سریتا کے قریب پہنچنے پر اُس نے کہا: "میں تمہیں نہیں پا سکتا بھابی۔"

"سریتا بہت خوش تھی۔ ہنستی ہوئی بولی۔" مجھے پانے کا دھیکا رہی نہیں ہے تمہیں۔"

وہ ایک ترچھے موڑ پر ہولی اور جلد ہی لشونت کی نگاہوں سے کافی دور ہو گئی۔ بہت زیادہ دوڑنے کے باعث اُس کا سانس پھول گیا تو وہ پہاڑی کے سب سے اوپر کے حصہ میں ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ گئی۔ یشونت کو اُس کے یہاں چھپنے کا مطلقاً علم نہ تھا۔ لیکن جب وہ یہاں سے دوڑتا ہوا گذرا تو اُسے سریتا کے ہانپنے کی آواز سنائی دی اور اُس نے مڑ کر جلدی سے اُسے اپنی باہوں میں کس لیا اور بولا: "مجھے میرا حق مل گیا۔"

سریتا نے اُس کی باہوں سے آزاد ہونے کی کوشش کی۔ لیکن یشونت کی باہوں کی گرفت اتنی کمزور نہ تھی کہ وہ معمولی کوشش سے خود کو آزاد کر لیتی۔ مجبوراً اُسے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دینا پڑا۔ لشونت سمجھا کہ وہ بے بس ہو کر رہ گئی ہے

لیکن اس کے فوراً ہی بعد وہ ایک جھٹکا دے کر اُس کی باہوں سے نکل بھاگی اور دور جاکر بولی۔ "یہ سراسر حق تلفی ہے۔ کسی دوسرے کے حق کو آسانی سے ہضم کر جانا ہنسی کھیل نہیں ہے للا۔"

سریتا کے نرم و گداز جسم کو اپنی باہوں میں لے کر شیونت کیف و سرور کی دنیا میں پہنچ گیا تھا لیکن سریتا کے جھٹکا دے کر نکل جانے اور اس کے ان لفظوں نے اُس کے جذبات کو اور بھی مشتعل کر دیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی طاقت کو ایک عورت شکست دے رہی ہے۔ اس مرتبہ وہ تیزی سے اُس کے پیچھے دوڑا اور جلد ہی اُس نے سریتا کو پھر اپنی باہوں میں جکڑ لیا۔

اس مرتبہ سریتا کچھ سہم سی گئی۔ لیکن ہمت کر کے ذرا بگڑ کر بولی۔ "چھوڑ دو شیونت بابو، تم حد سے تجاوز کرتے جا رہے ہو اور یہ ٹھیک نہیں ہے۔"

"دنیا میں جہاں ایسی اور بہت سی باتیں ہوتی ہیں وہاں ایک یہ بھی ہی۔" کہہ کر شیونت نے اسے پوری طاقت سے بھینچ لیا۔

"آخر تم چاہتے کیا ہو؟" سریتا نے تیز ہو کر کہا۔

"میں صرف تمہیں چاہتا ہوں سریتا۔"

"میں اور میرا جسم دو الگ الگ چیزیں ہیں۔"

"لیکن جسم سے زیادہ میں تمہیں اور پا بھی کہاں سکتا ہوں۔"

"اگر دل ہو تو اس میں سب کچھ پایا جا سکتا ہے۔"

"یہ محض خیال ہے۔ اس پر مجھے یقین نہیں۔ تم یہی سمجھ لو کہ میں تمہارے جسم ہی کو چاہتا ہوں۔"

"تو وہ تمہیں میری زندگی میں نہیں مل سکتا۔" سریتا یہ کہہ کر اُس کی

باہوں کی آغوش سے نکلنے کی کوشش کرنے لگی۔ اُس نے اُس کے ہاتھ پر کاٹ بھی لیکن لیشونت شاید مرنے جینے سے بے نیاز ہوچکا تھا۔ اُس نے اُس کی ذرا پروا نہ کی۔ اُس کی باہیں پہلے سے زیادہ سخت ہوگئیں سریتا کے نرم وگداز جسم کے لمس نے اُسے اندھا کر دیا۔ اُس نے سریتا کی گردن کو بڑی بیدردی سے دبانتے ہوئے کہا۔

"اگر مجھے یہ جسم نہ ملے گا تو میں اسے کسی اور کے لئے بھی نہ رہنے دوں گا۔"

سریتا نے کہا۔ "اس پہ تمہیں دعویٰ ہے کہ تم میرے سچے پریمی ہو۔ میرے لئے پریم کا یہ سودا مہنگا نہ ہوگا۔"

اچانک سریتا کی گردن کچھ زور سے دب گئی۔ بیساختہ اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ بیہوش ہو کر ایک مرجھاتی ہوئی کلی کی مانند گر پڑی۔ لیشونت کو اب ہوش آیا۔ سوچنے لگا اُس نے یہ کیا کیا سریتا کی جان ہی لے لی۔ کیا اب وہ خونی ہے؟ ...... خونی؟ اب کچھ دیر میں پولیس آکر اُسے گرفتار کرلے گی۔ مقدمہ چلے گا اور ...... اور اُس کی نگاہوں کے سامنے پھانسی کا تختہ آگیا۔ وہ کانپ اٹھا اور سر پکڑ کر وہیں اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ بہت دیر تک بیٹھا رہا تو اس درست ہونے پر پشیمان نگاہوں سے سریتا کی طرف دیکھا۔ سریتا کے پرشباب سینے کی ہلکی ہلکی جنبشیں ابھی اُس کی زندگی سے کھیل رہی تھیں روح اُس کے جسم کی قید سے آزاد نہ ہوئی تھی۔ وہ زندہ تھی۔ موت کے خوف نے اُسے بیہوش کر دیا تھا۔ دیکھ کر لیشونت کی جان میں جان آئی۔ وہ جلدی سے اٹھا اور تیزی سے پانی کی طرف بڑھا۔

نصف گھنٹے کی کوشش کے بعد سریتا نے آنکھیں کھولیں۔ کچھ دیر تو

وہ ویسے ہی پڑی رہی۔ پھر لیشونت نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اٹھایا اور وہ لیشونت کے جسم کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ ندامت نے لیشونت کی آنکھوں سے آنسوؤں کی گنگا جمنا بہا دی۔ جب اُس کے دل کی بھڑاس نکل چکی تو سریتا نے اپنی ساڑی کے پلو سے اُس کے آنسو پونچھے اور اُس کا سہارا لے کر چلنے کیلئے اٹھ کھڑی ہوئی

---

لیشونت اس دن کے بعد پھر کبھی سریتا کے ہاں نہیں گیا اور نہ کبھی اُسے سریتا کے متعلق یہ معلوم ہوا کہ وہ کس حال میں ہے اور کہاں ہے ایک دن ڈاک کے ذریعہ اسے سریتا کا خط ملا۔ لکھا تھا۔

لیشونت بابو!

اُس دن کے بعد نہ تو میرے یہاں آتے اور نہ میں تم سے مل سکی۔ تمہارا میرے یہاں نہ آنے کا سبب شاید یہی ہے کہ تم میرے سامنے آتے ہوئے شرماتے ہو۔ لیکن یقین مانو میں تمہیں ہرگز ہرگز گنہگار نہیں سمجھتی اور اگر تم گنہگار بھی ہو تو میں سچے دل سے تمہارا گناہ معاف کرتی ہوں۔ میں کلکتے جا رہی ہوں۔ اس واقعہ کو خاص طور سے اپنے دل میں جگہ نہ دینا۔

تمہاری ــــ سریتا

---

دو سال بعد۔۔

"پکچر ہاؤس" میں کلکتے کی ایک مشہور فلم کمپنی کا "آزادی" دکھایا جا رہا تھا۔ سریتا اس فلم کی ہیروئن تھی۔ لیشونت نے بھی وہ فلم دیکھا اور سریتا کے حسن و

شباب نے اُس کے دل میں اسے پھر ایک بار دیکھنے کی خواہش پیدا کردی۔

جب یشونت کلکتے میں نوین کے یہاں پہنچا تو گھر پر صرف سر بتا ملی اس نے دیکھا کہ وہ گلے میں وہی پانچال پہلے کا رومال باندھے ہوئے تھی۔ یشونت کو دیکھتے ہی اُس کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمکنے لگیں۔ یشونت کے ہاتھ سے اٹیچی کیس لے کر ایک طرف رکھ دیا اور اُسے ایک کرسی پر بٹھا کر خود اُس کے قریب ہی ایک دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

"میں بیمار ہوں یشونت بابو! میرے گلے میں درد رہتا ہے" اُس نے کہا۔

"شاید اُسی دن سے" یشونت نے پوچھا۔

مسکرا کر سر بتا نے سر ہلا دیا۔

یشونت بولا" میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا سر بتا۔ یہ رومال میں نے ہی سنیما میں تمہاری ساری کے پلّو سے باندھا تھا"

سر بتا نے اُس کی بات کی طرف ذرا بھی توجہ نہ دی اور بولی "نہ جانے کیوں، بہت دنوں سے میں یہ محسوس کرنے لگی تھی۔ اب میں تم سے کبھی کوئی پردہ نہیں رکھنا چاہتی یشونت بابو۔ مجھے بھی تم سے محبت ہے اور مجھے یقین ہے کہ میری محبت گناہ نہیں لیکن میں جسم کے میل کو محبت کے خلاف سمجھتی ہوں اپنے سے محبت کرنے والے کو "ظالم" بنانا مجھے منظور نہ تھا۔ اس لئے میں تم سے بہت دور چلی آئی۔ ایک تعجب خیز بات سناؤں۔ سن کر شاید تم ہنس بھی دو۔ اُس دن سے اکثر میری گردن میں درد ہوتا ہے۔ بہت علاج کیا لیکن "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" کے مصداق درد کی شکایت پہلے سے بھی زیادہ ہو گئی۔ ایک دن یہ رومال نکال کر میں نے اپنی گردن کے گرد لپیٹ لیا۔ یقین مانو اسی وقت

درد کی تمام شکایت رفع ہو گئی اور میں یہ یقین کرنے پر مجبور ہو گئی کہ رومال اور درد دونوں ہی مجھ سے محبت کرنے والے کی نشانی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ جب تک رومال میری گردن سے لپٹا رہتا ہے درد نہیں ہوتا اور جب رومال گردن سے علیحدہ کر دیتی ہوں تو درد شروع ہو جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے لیشونت کہ آنکھوں میں تم، دل میں تم، میرے جسم کے روئیں روئیں میں تم ہی تم ہو۔ کاش تم مجھ سے میرا جسم طلب نہ کرو۔ گو یہ مشکل نہیں ہے لیکن اگر تمہیں مجھ سے سچی محبت ہے تو میرے محبوب، اپنی محبوبہ کے جسم کو "شجر ممنوعہ" سمجھو۔ محبت نام ہے ایک پاک جذبے کا۔ پرماتما کے لئے اسے جسم کے میل سے گناہ کے دریا میں نہ بہاؤ۔ مجھ سے صرف مجھے طلب کرو۔ میں تمہاری ہوں، دنیا کی کوئی طاقت تمہارے خلاف میرے دل میں کوئی جذبہ پیدا نہیں کر سکتی ..... "

سریتا کہے جا رہی تھی ... لیکن جب اُس نے منہ اٹھا کر لیشونت کی طرف دیکھا تو وہاں موجود نہ تھا۔ وہاں سے ہٹ کر اُس کی نگاہیں دروازہ کی جانب گئیں۔ لیشونت جا رہا تھا، وہ خاموش سی اُس کی پشت کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ دیکھتی رہی اُس وقت تک جب تک وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گیا۔

# حقیقت کھلنے کے بعد

بھیانک رات تھی۔ بادل گرج کر برس رہے تھے۔ سخت تیز ہوائیں شائیں شائیں کر رہی تھی۔ بارش کی بوچھاڑ رہ رہ کر آنکھوں کے سامنے ایک ایسا پردہ پھیلا رہی تھی کہ آگے بڑھنے کی راہ تک دکھائی نہیں دیتی تھی۔ جگہ جگہ پانی بھرا ہوا تھا۔ سڑکیں اور گلیاں کیچڑ سے لت پت ہو رہی تھیں۔ کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اس وقت گھر سے باہر نکلتا لیکن گریٹا گاربو کی فلم کی نمائش ہو رہی ہو اور پہلے ہی دن اُسے نہ دیکھنا میرے نزدیک اپنا اصول توڑنے کے مترادف تھا اور اس کے لئے میں ہرگز تیار نہ تھا۔

کھیل ختم ہونے کے بعد میں سنیما ہال سے باہر نکلا تو مجھ پر اداسی چھا رہی تھی۔ خیال تھا کہ گریٹا گاربو کی دوسری فلموں کی طرح یہ فلم بھی یقیناً دلچسپ ہوگا لیکن اُس کا یہ فلم حد درجہ کمزور اور غیر دلچسپ تھا۔ کتنے شوق سے میں فلم دیکھنے آیا تھا لیکن فلم دیکھنے کے بعد مجھے جس قدر مایوسی ہوئی بیان نہیں کر سکتا۔

بارش تو تھم چکی تھی لیکن ہوا اب بھی اُسی رفتار سے چل رہی تھی۔ سردی ہونے کے باعث رہ رہ کر جسم کانپ اٹھتا تھا۔ کمانیہ گیٹ کے پاس ہی ہنومان جی کے مندر تک جانا تھا۔ فاصلہ کافی تھا اور اس وقت یہ فاصلہ طے کرنا بہت تکلیف دہ معلوم ہو رہا تھا۔ تانگہ پر سوار ہو کر جانا کوئی مشکل تو نہ تھا لیکن جیب میں صرف دو پیسے تھے۔ گھر سے چلتے وقت اگر چھ پیسے اور لے لئے ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ اور اپنی اس غلطی پر میں اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا لیکن اب پیدل چلنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اسی لئے مجبوراً اسی کیچڑ میں آہستہ آہستہ گھر کی طرف چل پڑا۔ دل ہی دل میں فلم ساز اور گریٹا گاربو کو کوستا ہوا اپنا سا منہ لئے چلا جا رہا تھا کہ سامنے ایک چوراہے پر ایک عورت اور ایک مرد کو دیکھ کر خاص طور پر میں نے اُن کی طرف پھر دیکھا۔

نوجوان چھتری تانے کھڑا تھا لیکن عورت چھتری کے باہر کھڑی بارش میں بھیگ رہی تھی۔ نوجوان کا منہ دوسری طرف تھا اور پشت میری طرف۔ عورت بھیگ کر شرابور ہو چکی تھی۔

نوجوان اُس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا اور وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا جسم سردی کی وجہ سے کانپ رہا تھا اور شاید کچھ خوف کی وجہ سے بھی تھر تھرا رہا تھا۔

میں ابھی اُن سے تقریباً پانچ فٹ کے فاصلہ پر تھا کہ اچانک عورت نے میری طرف دیکھا۔ نگاہوں سے نگاہیں ملیں۔ اسے دیکھتے ہی میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ڈر کے مارے ایک دم اس کی چیخ نکل گئی اور وہ بے تحاشہ وہاں سے بھاگ اٹھی۔

وہ عورت، میرے دوست رمیش کی بیوی میری وینا بھابی تھی۔ میں

بھونچکا سا انھیں دیکھتا ہی رہ گیا۔

اچانک نوجوان بھی حیرت زدہ ہوکر مجھے دیکھنے لگا۔ اُس نے مجھے پہچان لیا اور میں نے بھی اسے دیکھ لیا، اپنی اس ذلیل حرکت پر شرمندہ ہونے کی بجائے وہ اُلٹا ناراض ہونے لگا۔ اُس کے چہرے سے غصہ کی علامات ظاہر تھیں۔ لیکن کچھ کہے بغیر ہی وہ وہاں سے چلا گیا۔

اُماکانت تھا وہ! دل ہی دل میں سیکڑوں گالیاں دیتا ہوا، میں بھی وہاں سے چل پڑا۔

اُماکانت ایک اوباش طبع نوجوان تھا۔ جب وہ اسکول میں پڑھتا تھا اُس وقت بھی اُس کے خیالات حد درجہ ذلیل اور گندے تھے اور اب تو وہ اپنی ذلیل حرکتوں کے باعث بہت بدنام ہو چکا تھا۔ ہر شخص اُسے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا اور پاس پڑوس کی لڑکیاں تو اس کے سائے سے بھی بچ کر چلتی تھیں، ایسے اوباش طبع نوجوان کی آغوش محبت میں وینا بھابی! میں سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔ رمیش بے چارے کی حالت پر مجھے ترس آیا اور بھابی سے نفرت ہوگئی۔

لیکن بھابی سے اُماکانت کا تعارف کیسے ہوا؟ وہ تو گاؤں کی رہنے والی ہیں۔ ابھی صرف دو ہی مہینے تو ہوتے ہیں کہ وہ یہاں آئی ہیں۔ اور اُماکانت ہے پونہ کا ایک فیشن ایبل آوارہ نوجوان! رمیش سے اُماکانت کی جان پہچان تھی۔ میں بھی اُس سے متعارف تھا۔ لیکن بھابی کا اُس کے ساتھ تعارف کرایا جائے، اس قابل نہیں تھا وہ، اور اگر وہ رمیش کے گہرے دوستوں میں سے ہوتا تو خیر کوئی بات نہ تھی لیکن اُس کے ساتھ صرف نمستے تک ہی ملاقات تھی اور ہر باعزت شخص اُس سے دور رہتا تھا۔ پھر وینا بھابی کا اُس کے ساتھ

تعارف کیسے ہوا اور اتنی جلد اتنے گہرے تعلقات کیسے ہو گئے؟

میرے دل و دماغ میں خیالات کا ایک تانتا سا بندھا ہوا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ حقیقت تھی یا وہم، میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ کہیں یہ سب خواب تو نہیں تھا؟ رمیش سے بھی اس کا ذکر کرتے ہوئے میں کچھ گھبراتا تھا۔ کیونکہ وہ بے حد شکّی مزاج اور چھوٹے سے دل کا مالک تھا۔

شک دور کرنے کا صرف ایک طریقہ تھا۔ رمیش کا مکان نکشمی روڈ پر تھا۔ جلدی جلدی قدم بڑھاتا ہوا اس کے مکان پر جا پہنچا۔ تقریباً نصف گھنٹے تک میں اسے آوازیں دیتا رہا آخر اکتا کر وہاں سے چلنے ہی والا تھا کہ رمیش آنکھیں ملتا ہوا برآمدے میں نظر پڑا۔

"کون ہے؟" وہ گھبرایا ہوا سا بولا۔

"میں ہوں امر ذرا نیچے آؤ۔"

وہ نیچے آیا، چھتری بند کر کے میں بھی دروازے کے پاس جا پہنچا۔

اسے دیکھتے ہی یکایک میرے خیالات نے پلٹا کھایا۔ سوچنے لگا۔ اس سے میں کیا کہوں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا مجھے خاموش دیکھ کر ذرا گھبراتے ہوئے اس نے پوچھا: امر تم چپ کیوں ہو؟ ...... کچھ کہو نا آخر بات کیا ہے، اس وقت کیوں آئے ہو؟"

"کچھ نہیں، کوئی خاص بات نہیں۔"

"تو پھر اتنی رات کو ......؟"

"سنیما دیکھ کر واپس آ رہا تھا۔ سوچا تم سے ملتا چلوں ..... آج سے گریٹا گاربو کا نیا فلم دکھایا جا رہا ہے، تم آئے نہیں۔ بھابی کو تو بہت دلچسپی

ہے سنیما سے، آج اکیلی گئی تھیں شاید وہ؟"

"یعنی؟ میں سمجھا نہیں! وہ سنیما دیکھنے گئی اور اکیلی؟" کہہ کر وہ ہنس پڑا۔ اس کی اس ہنسی سے صاف ظاہر تھا کہ میں بالکل بیوقوف ہوں۔

"مجھے تو ایسا ہی معلوم ہوا! ہوبہو وینا بھابی کی طرح تھی وہ!"

"کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے ہو تم؟" وہ پھر ہنس پڑا۔

میں جھینپ سا گیا۔ لیکن پھر بھی میرے خیالات کا سلسلہ ختم نہ ہوا۔ بھابی ہرے جوڑے کنارے کی سفید ساڑی پہنے ہوئے تھیں اور وہ بارش سے بھیگ کر شرابور ہو گئی تھیں اگر اُما کانت کے ساتھ میں نے بھابی ہی کو دیکھا تھا تو یقیناً گھر پہونچتے ہی انھوں نے ساڑی تبدیل کر لی ہو گی اور بال بھی کھول کر خشک کر لئے ہوں گے۔

"مجھے صرف پاگل ہی نہیں بلکہ اور جو کچھ جی میں آئے کہہ لو لیکن پہلے بھابی کو ......"

"اب چپ چاپ گھر جا کر سو رہو، تم اس وقت ہوش میں نہیں ہو۔ حسن و جوانی کے ساغر میں چھلکتی ہوئی گریتا کسی تیز شراب بےکہ ہوش کن اثر کی مانند تمہیں بے سُدھ بنائے ہوئے ہے!" اتنا کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔

اندر جا کر وہ دروازہ بند کرنے ہی والا تھا کہ میں نے کہا "رمیش، آج سوتے وقت بھابی نے کونسی ساڑی پہن رکھی تھی بتا سکتے ہو تم؟"

"کیوں؟ سفید ساڑی پہنے ہوئے تھیں وہ!"

"اور وہ جوڑے ہرے کنارے کی تھی نا؟"

"ہاں تھی تو ایسی" اور وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"تو پھر اب جا کر دیکھو کہ بھابی نے وہی ساڑی پہن رکھی ہے یا کوئی

اور ؟ اور ان کے بالوں کو بھی ذرا ہاتھ لگا کر دیکھتا کہ وہ گیلے ہیں یا خشک ؟"
"امر سچ مچ کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے ہو تم ؟ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو ؟ اب مہربانی کر کے گھر جاؤ ! ناحق میری نیند کیوں خراب کر رہے ہو ؟"
کہہ کر اُس نے ایک دم دروازہ بند کر لیا۔

کیا سچ مچ میں پاگل ہو گیا تھا ؟ میرے دل و دماغ میں پھر اُن ہی خیالات کا ایک طوفان سا برپا ہو گیا۔ کہیں مجھے دھوکا تو نہیں ہوا ؟ نہیں ، نہیں ، آنکھوں دیکھا واقعہ کبھی دھوکا نہیں ہو سکتا۔ اُما کانت بھابی کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔

---

دوسرے دن تقریباً نو بجے میں اُن کے یہاں گیا۔ اُس کا چہرہ دیکھتے ہی میں کچھ گھبرا سا گیا۔ اُس کی آنکھوں میں افسردگی اور چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کمزور آواز میں بولا۔

"امر سچ سچ بتاؤ ، یہ کیا قصہ ہے ؟"

اُس کا یہ سوال سن کر میں بوکھلا سا گیا۔ وہ مشکوک نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کی افسردہ آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

"قصہ ! کیسا قصہ ؟ کچھ بھی نہیں !"

"تم نے رات جو کچھ کہا تھا وہ بالکل ٹھیک نکلا۔ اُس کے بال واقعی گیلے تھے اور وہ ہرے کنارے کی سفید ساڑی بھی نیچے سوکھ رہی تھی۔ دس بجے تک ہم دونوں جاگتے رہے اور اُس وقت تک وہ سفید ساڑی ہی پہنے ہوئے تھی۔ پھر یہ جارجٹ کی ساڑی کب پہنی ؟"

"بہت شکی ہو یار ، تم بھی ! میں تو مذاق کر رہا تھا۔"

کہنے کو تو میں کہہ گیا لیکن مجھے امید نہ تھی کہ میری اس بات کا اُس پر

کوئی اثر ہوگا۔ شک کی میرے نزدیک اب کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ وہ عورت کوئی اور نہیں بھابی ہی تھی' کل کے اُس واقعہ کو میں کیسے دہراتا؟ یہ سب سن کر اُس کا شک یقیناً اور بھی پختہ ہو جاتا۔ بھابی اس کی رفیقۂ حیات تھیں اور ابھی صرف دو ہی مہینے ہوتے تھے کہ اُن کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ منّن بھابی ایسی خوبصورت بیوی پاکر پھولا نہیں سماتا تھا اور بھابی کو بھی اس عرصہ میں میں نے کبھی افسردہ نہیں دیکھا تھا' وہ بے حد مسرور نظر آتی تھیں۔ دونوں ہی مسرور مطمئن دکھائی دیتے تھے۔ کیا میں اُن کی اس مسرور زندگی میں محبت کی بڑھتی ہوئی لہروں کے آگے نفرت کی باڑھ لگا دوں؟ نہیں' نہیں' یہ کام مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ یہ سوچ کر میں اُس کی باتوں کو سنی اَن سنی کر کے ٹالتا رہا لیکن لمحہ بہ لمحہ اس کی خواہش بڑھتی ہی گئی۔ میری خاموشی سے اس کا شک اور بھی بڑھتا گیا اور آخر مجبور ہو کر مجھے سب کچھ بتانا ہی پڑا۔

اور سب کچھ سنتے ہی اس کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔

"چلو' اسی وقت چلو' میں اس بات کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں اور اگر یہ سچ ثابت ہوئی تو میں ....."

وہ بڑبڑاتا ہوا کوٹ اور ٹوپی پہن کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

"کہاں جا رہے ہیں ہم؟" سڑک پر پہنچتے ہی میں نے سوال کیا۔ لیکن جواب دینے کی بجائے وہ ہکا بکا سا میری طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔

اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"بھابی سے تو اس بارے میں تم نے ابھی کچھ کہا سنا نہیں۔"

"ساڑی اور بالوں کے گیلے ہونے کے بارے میں پوچھا تھا اس سے!

لیکن امرود بہت چالاک اور ہوشیار عورت معلوم ہوتی ہے گناہ پر پردہ ڈالنے کے لئے وہ صرف شرارت سے ہنس دی اور ہنسی ہنسی میں بات ٹال کر مجھے رجھانے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن مجھے اس کی پاک دامنی پر شک ہے جب میں نے اس کے متعلق پوچھا تو وہ کچھ جھینپ سی گئی۔ اُس وقت اُس کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔ غصہ سے میں بالکل بے قابو ہو رہا تھا۔ اُسی وقت سے ہم دونوں کے درمیان نفرت کی ایک ایسی دیوار حائل ہو گئی ہے جو شاید ہی اب محبت میں تبدیل ہو سکے۔

نہ جانے کتنی کشادہ اور تنگ و تاریک گلیوں کے چکر کاٹتے ہوئے ہم ایک بنگلے کے سامنے جا پہنچے۔ دروازے پر لگی ہوئی تختی کو دیکھتے ہی میں ایک دم چونک پڑا۔ اُما کانت لکھا تھا اس پر۔

رمیش فوراً اندر داخل ہو گیا۔ اُما کانت برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ ہم دونوں کو دیکھتے ہی اس کے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں لیکن پھر بھی وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"اوہ، رمیش! آج کیسے راستہ بھول گئے؟ اور ہاں آپ کی شادی کی دعوت ابھی تک آپ کے ذمہ ہے۔"

"میں اُسی دعوت ہی کے سلسلہ میں آیا ہوں۔

لیکن اُما کانت کوئی دودھ پیتا بچہ نہ تھا۔ وہ ہماری آمد کی وجہ سمجھ گیا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ گھبرایا ضرور لیکن پھر نہ جانے کیوں اُس کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ وہ بہت چالاک اور ہوشیار انسان تھا اُس نے دوسری باتوں کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع کرنا چاہا لیکن رمیش کے چہرے پر غصہ کے آثار

دیکھ کر وہ خوف زدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"اماکانت کل رات کے واقعہ کے متعلق میں بالتفصیل معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تم میرا مطلب تو سمجھ گئے ہو گے؟" رمیش کے غصہ کا پارہ لمحہ بہ لمحہ چڑھتا جا رہا تھا۔

"آپ مجھے تھوڑا اس وقت دیجئے!" اتنا کہہ کر اُماکانت اندر چلا گیا۔

دس پندرہ منٹ کے بعد جب وہ باہر آیا تو اُس کے ہاتھ میں چند خطوط تھے۔ رمیش کے چہرے پر مردنی سی چھا گئی۔ اور میں سمجھ گیا کہ وہ خطوط بھابی کے لکھے ہوئے ہیں۔

اُن خطوط میں سے ایک خط خاص طور پر اُس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے اُماکانت نے کہا "آپ اسے پڑھ لیجئے اور پھر فیصلہ کیجئے گا کہ میں قصوروار ہوں یا ....." وہ کہتا کہتا رک گیا۔ نہ جانے کیوں؟

وینا بھابی نے آج سے چار سال پیشتر اُماکانت کے نام انگریزی میں یہ خط لکھا تھا۔

رجنی پور

۳۰ دسمبر ۱۹۴۱ء

مائی ڈیر اُوما!

تمہارا خط پڑھ کر میرے دل نے جو اذیت محسوس کی ہے بیان نہیں کر سکتی۔ تم مجھ سے معافی چاہو۔ ایسا کون سا گناہ تم سے سرزد ہو گیا ہے۔ تمہارا خیال ہے کہ میں تم سے محبت نہیں کر سکتی۔ یہ خیال تمہارے دل میں کیسے پیدا ہوا؟ تم نے مجھے آخری سانس تک کے لئے اپنا بنا لیا ہے۔ تم نے

اگر بدنامی اور رسوائی کا سارا بار اپنے سر لے کر مجھے
بیگناہ ثابت نہ کیا ہوتا تو رجسٹرار اور کالج کے دیگر اراکین مجھ
پر ہرگز ہرگز اعتبار نہ کرتے۔ تمہاری صاف گوئی سے میں
تو بچ گئی مگر افسوس ہے کہ تمہیں کالج چھوڑنا پڑا جس دن
سے میں نے پونہ چھوڑا ہے۔ یقین مانو ہر روز تمہیں یاد
کرتی ہوں۔ کتنی خوش تھی میں پونہ میں! تمہاری محبت
کے سائے میں وہ دن کتنے مزے میں گذر رہے تھے۔ رہ
رہ کر اُن دنوں کی یاد ستاتی ہے۔ سچ کہتی ہوں اب بھی
میرے دل میں تمہارے لئے اتنی ہی محبت موجود ہے۔
میں اب بھی تمہیں اتنا ہی چاہتی ہوں۔ لیکن تم سے میری
ایک درخواست ہے کہ میرے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا
نہ ہو جانا اور اپنی دینا کو کبھی نہ بھولنا۔

تمہاری ــــ دینا

خط پڑھتے ہی رمیش کا غصہ کافور ہو گیا۔ اور نیم مردہ سا ہو کر بس کے پچھلے حصہ پر گر پڑا۔ اُما فاتحانہ انداز سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"جس انہونی بات کے باعث مجھے کالج سے نکالا گیا اُس کی ذمہ دار دینا دیوی ہی تھی۔ اگرچہ اُسے ایکسپل (EX PEL) نہیں کیا گیا لیکن کالج کے ذمہ دار اراکین کے مشورہ سے مجبوراً اُسے بھی کالج چھوڑنا پڑا۔"

"کیا کہا، پونہ کے کالج میں کب پڑھتی تھیں وہ؟ وہ تو بمبئی میں پڑھتی تھیں۔" حیرت سے میں نے پوچھا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ لیکن انٹر تک۔ وہ پونہ میں ہی پڑھی

نہیں۔ اگر یقین نہ ہو تو آپ انہیں سے پوچھ لیجئے گا۔ اس خط سے آپ کیا کچھ نہیں سمجھ سکے؟ اگر مجھے ایکسپل نہ کیا گیا ہوتا تو میں ........ اب تو یقین آگیا نہ؟ ہم دونوں کو بہت عرصہ سے ایک دوسرے سے محبت سی ہے۔"

اُما کانت کی یہ بات سنتے ہی رمیش جو اب تک خاموش بیٹھا تھا فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور غصہ سے دانت پیستا ہوا اُما کانت پر جھپٹا۔ میں اُسے روکنے کیلئے ابھی اٹھا ہی تھا کہ اُس نے اُما کو زور سے ایک گھونسہ لگا کر اُسے نیچے گرا لیا۔ اُما اناپ شناپ بکنے لگا۔ میں گھبرا اٹھا کہ خدا جانے اب اس جھگڑے کا کیا انجام ہو؟

وہاں اب زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہ تھا اس لئے میں نے رمیش کا ہاتھ پکڑا اور زبردستی گھسیٹتا ہوا اُسے وہاں سے لے آیا۔

---

تیسرے پہر تین بجے کے قریب جب میں رمیش کے یہاں گیا تو وہ اور بھابی ڈرائنگ روم کے ساتھ والے کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے رمیش کے لہجہ میں سختی تھی اور بھابی بہت آہستگی کے ساتھ اُس کی ہر بات کا جواب دے رہی تھیں لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بھابی کا ہر جواب رمیش کے غصہ کی دہکتی ہوئی آگ پر تیل کا کام کر رہا ہے۔ یکایک وہ تیزی سے بھڑک اٹھا۔ نہ جانے اُس نے کیا کہا میں اچھی طرح سن نہ سکا۔

رمیش نے شاید کوئی ایسی بات کہی تھی جسے بھابی برداشت نہیں کر سکیں اور وہ اس زور سے گرجیں کہ اُن کی آواز ڈرائنگ روم میں بھی گونج اٹھی۔

"خبردار، آپ اس طرح کی باتیں منہ سے نہ نکالئے ورنہ اس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔ میں نے آپ کے سامنے دل کھول کر رکھ دیا ہے۔ ساری باتیں

سچ سچ بتادی ہیں۔ پھر بھی اگر آپ کو یقین نہ آئے تو میں کیا کروں ؟'

"آپ کو جو کچھ کرنا ہو کر لیجئے۔"

"لیکن تمہارے لکھے ہوئے وہ خطوط میں نے اپنی آنکھوں سے پڑھے ہیں۔ میں تمہاری باتوں پر کیسے یقین کر سکتا ہوں۔"

"میں ہرگز یہ ماننے کے لئے تیار نہیں۔ وہ بدمعاش آپ کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ میں اور اسے خط لکھتی۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا اور رات کے واقعہ کے بارے میں جو آپ کہتے ہیں، اس کے متعلق میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں......"

"بس چپ رہ کلنکنی! خود کو پاک دامن ثابت کرنے کی زیادہ کوشش نہ کر۔ میں اب اچھی طرح جان گیا ہوں کہ تو کتنی پاک دامن ہے۔" جھلّا کر دھڑام سے دروازہ کھول کر وہ ڈرائنگ روم میں آگیا اور مجھے دیکھتے ہی غصہ سے دانت پیستا ہوا بولا۔ "کیا کروں، کیا نہ کروں امر؟ میری عقل کام نہیں کر رہی ہے۔ کاش کہ میں اُسے طلاق دے سکتا لیکن افسوس ہمارے مذہب میں یہ ممکن نہیں۔"

اور میں ابھی اس بات کا جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ ایک بپھری ہوئی شیرنی کی طرح گرجتی ہوئی سجاتا بھی وہیں آپہونچیں۔

"اچھا تو آپ کے یہ دوست بھی یہیں تشریف فرما ہیں کتنے اچھے ہیں آپ کے یہ دوست بھی! دوسروں کی ہنستی ہوئی دنیا میں آنسوؤں کے کانٹے بونے والے، دو خوش حال زندگیوں کو نفرت کے عمیق ترین غار میں دھکیلنے والے آپ کے یہ دوست! آرتی اتاریئے ان کی۔"

بلا سوچے سمجھے، طیش میں آکر سجاتا کو مارنے کے لئے وہ آگے بڑھا

ہی تھا کہ ایک دم لپک کر میں نے اُسے پکڑ لیا اور بھابی دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر دھم سے بے حس و حرکت لاش کی طرح کاؤچ پر گر پڑیں اور سسک سسک کر رونے لگیں۔

لیکن تھوڑی دیر کے بعد وہ خود ہی اُٹھ بیٹھیں اور ندامت سے میری طرف دیکھتی ہوئی بولیں "امر بھیّا، معاف کرنا مجھے! غصہ کے باعث نہ جانے میں کیا کیا کہہ گئی۔ صبح پتاجی کو تار دیا ہے میں نے ...... اُن کے آنے پر شاید آپ لوگوں کا شک دور ہو جائے گا۔"

"اپنے باپ کی آمد سے خوف زدہ نہ کرو مجھے! میں جانتا ہوں کہ وہ پولیس انسپکٹر ہیں، لیکن مجھے اُن سے کیا مطلب؟ وہ یہاں آ کر جو رو نا روئیں گے وہ دکھائی دے رہا ہے۔"

مجھ سے اُن کی یہ سب باتیں نہ سنی گئیں اور میں چپ چاپ وہاں سے کھسک گیا۔

---

گھر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ رمیش بھی آ پہنچا۔ غم و غصہ سے اُس کا بُرا حال ہو رہا تھا۔

"امر کیا کوئی یقین کر سکتا ہے اس بات پر؟ تمہارا دل کیا کہتا ہے؟ کیا سچ مچ وہ بے گناہ ہے؟" کہتے کہتے اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔

میں خاموش رہا۔

"اُس نے میری آنکھوں میں دھول جھونکنے کی بہت کوشش کی لیکن مجھے دھوکا دینا آسان نہیں۔ میں تریا چرتر سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

بھابی نے صفائی کے طور پر رمیش سے کیا کہا تھا میں یہ جاننے کیلئے

بقرار ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "کیا کہا اُنھوں نے تم سے؟"

رمیش کچھ دیر تک خاموش رہا۔ پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔

"پانچ برس پہلے اُس کے پتاجی رجنی پور میں سب انسپکٹر پولیس تھے۔ اُماکانت کے چچا بھی وہیں سب رجسٹرار تھے۔ دونوں ایک ہی احاطہ میں رہتے تھے۔ ایک سال گرمیوں کی چھٹیوں میں اُماکانت اپنے چچا کے یہاں آیا ہوا تھا۔ دینا نے اُسی سال میٹرک پاس کیا تھا۔ اور کالج میں داخل ہونا تھا مگر ابھی یہ طے نہ ہوا تھا کہ پونہ کے کسی کالج میں داخلہ لیا جائے یا بمبئی میں! اُن دنوں اُماکانت پونہ ہی میں پڑھتا تھا۔ ایک ہی احاطہ میں رہنے کے باعث دونو خاندانوں میں کافی میل ملاپ تھا۔ اسی وجہ سے تمہاری بھابی کی اُماکانت سے جان پہچان ہو گئی اور آخر یہ طے پایا کہ اُس کی پڑھائی پونہ ہی میں ہو۔

ایک دن دینا اپنے مکان کی تیسری منزل پر بیٹھی ستار بجا رہی تھی۔ اُس وقت اُس کے سوا گھر میں کوئی نہیں تھا۔ وہ اکیلی تھی اُماکانت شاید پہلے سے ہی ایسے موقعہ کی تلاش میں تھا۔ موقع پاتے ہی دبے پاؤں وہ پہنچ گیا اور آہستہ سے اندر کی کنڈی لگا لی۔ دینا کو اُس کی آمد کا اس وقت علم ہوا جب اُماکانت نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تم ستار بجانے میں بہت ماہر دکھائی دیتی ہو!"

چونک کر جب اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو کمرے کا دروازہ اندر سے بند پایا۔ اُماکانت للچائی ہوئی نگاہوں سے اُسے دیکھتا ہوا پاس ہی کھڑا تھا۔ دینا کوئی دودھ پیتی بچی نہ تھی۔ فوراً ہی اُس کا مطلب سمجھ گئی۔ مگر بھولے پن سے بولی "کہیئے کیسے آنا ہوا؟ اس وقت گھر میں کوئی بھی نہیں ہے۔ پھر کسی وقت آجائیے گا۔"

"مجھے گھر کے اور لوگوں سے کیا مطلب ؟ مجھے تو تم سے کام ہے وینا؟"
اُس نے وینا کے اور بھی قریب ہوتے ہوئے کہا۔

"فرمایئے ؟"

"وینا جب سے تمہیں دیکھا ہے' نہ جانے میرے دل کو کیا ہو گیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ بس ......" کہتے کہتے وہ آگے بڑھا اور وینا کو پکڑ کر اپنی آغوش میں کھینچنا ہی چاہتا تھا کہ وینا نے بڑی پھرتی سے ستار اُس کے سر پر دے ماری۔ اُس کی پیشانی میں سخت چوٹ آئی اور وہ لہولہان ہو کر فرش پر گر پڑا اور وینا جلدی سے دروازہ کھول کر بے تحاشہ نیچے بھاگ گئی۔

شام کو جب وینا کے پتا کو اس بات کا علم ہوا تو غصہ سے آگ بگولہ ہو گئے۔ اگر اُس کے چچیک کے ساتھ دوستی نہ ہوتی تو یقیناً اُماکانت کو قید کرا دیتے' اس کے علاوہ بدنامی کے خوف کے باعث انھوں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

اس حادثہ کے بعد جب وینا پونہ آئی تو وہ ہمیشہ اُماکانت سے بچ کر رہتی۔ رات کو جب سوتی تو اندر سے تالا لگا کر اُس کی کنجی اپنی کلاس فیلو اُما کو دے کر سوتی ۔۔۔ اُما سے اُماکانت کا تعارف کب ہوا اور کیسے ہوا؟ اس کے متعلق وینا مطلقاً نہیں جانتی' ایک دن رات کو اُما کی مدد سے وہ اُس کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وینا ابھی جاگ ہی رہی تھی اور مسہری پر لیٹی ہوئی ایک ضروری سبق دہرا رہی تھی' اچانک اُسے دیکھتے ہی وہ گھبرا سی گئی اور اتنی زور سے چیخ اُٹھی کہ آس پاس کے کمروں سے لڑکیاں اور ریکٹر بھی وہاں آپہونچے۔ ریکٹر نے آتے ہی تمام لڑکیوں کو وہاں سے بھگا دیا۔ اُماکانت پہلے ہی وہاں سے فرار ہو چکا تھا۔ اُما ایک بھولی بھالی کمزور دل لڑکی تھی۔ ریکٹر کی ایک ہی ڈانٹ میں

اُس نے صاف صاف بتا دیا اور معافی مانگ کر بچ گئی لیکن اُماکانت دوسرے ہی دن کالج سے نکال دیا گیا۔ اُما عورت تھی ..... کنواری تھی۔ اس لیے کالج کے ارا کین نے اُس کا نام بلیک لسٹ میں نہیں لکھا مگر شرمندگی کے باعث اُسے کالج چھوڑنا ہی پڑا۔

اور جب یہ تمام باتیں وینا نے اپنے پتا کو لکھیں تو اس مرتبہ بھی انھوں نے اُماکانت کو معاف کر دیا۔ اس کے بعد وینا انٹر پاس کر کے بمبئی چلی گئی۔ وہیں اُس نے بی۔ اے پاس کیا۔" اتنا کہہ کر رمیش خاموش ہو گیا۔

بھابی بے گناہ ہیں، اس بات پر مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا اور رمیش بھی اُن کی صفائی کا قائل نہ تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اُن دو حادثوں کے بعد وینا کا پاک دامن رہنا نا ممکن ہے اور پھر اُس کے لکھے ہوئے خطوط اور اُس بھیانک رات میں اُماکانت سے ملاقات اُس کی پاک دامنی کے خلاف ایسے ثبوت ہیں جن کی روشنی میں اُسے ہرگز پاک دامن قرار نہیں دیا جا سکتا۔

میں نے بہت سوچا لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ دل اندر ہی اندر طوطے کی طرح ایک ہی بات رٹ رہا تھا۔

دوسرے دن صبح میں سو کر اٹھا ہی تھا کہ رمیش کا نوکر مجھے بلانے آیا۔ میں جلدی جلدی تیار ہو کر اُس کے ساتھ ہو لیا۔

اور جب رمیش کے یہاں پہونچا تو ڈرائنگ روم میں رمیش، وینا، بھابی اور اُس کے پتا جی بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی رمیش کے سسر بولے "یہی ہیں شاید آپ کے دوست؟ اور انھوں نے ہی شاید وینا اور اُس پاجی اُماکانت کو سڑک پر دیکھا تھا؟"

"جی ہاں" یہی ہیں وہ! میری ان کے ساتھ بچپن سے دوستی ہے۔"
"تبھی تمہارے بھلے بُرے کا اتنا خیال ہے انھیں۔"

اُن کے کہنے کا انداز بہت طنز آمیز تھا۔ میں تو پہلے ہی نگاہیں جھکائے بیٹھا تھا۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا۔ اُن کی اس بات پر رتیش نے بھی سر جھکا لیا۔

"اُس حرامی کے بال پکڑ کر گھسیٹتا ہوا یہاں لاتا ہوں" اتنا کہہ کر وہ ایک دم غصہ میں بھرے ہوئے اٹھے اور تیزی سے کمرہ سے باہر نکل گئے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ واقعی اُسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ ایک گنہگار کی طرح سہما ہوا سا ہماری طرف دیکھتا ہوا ایک طرف کھڑا ہو گیا اور رتیش کے سسر نے وینا بھابی کو زور سے آواز دی۔" وینو! وینو بیٹیا۔"

وینا بھابی اپنے پتا کی آواز سنتے ہی فوراً اندر آگئیں اور... اُما کانت کی طرف دیکھتے ہی اپنا نچلا ہونٹ آہستہ سے دبایا اور نفرت سے دیکھتے ہوئے بولیں "آ گیا یہ۔"

"آتا کیسے نہ؟ گھسیٹ کر لایا ہوں! کہیں باہر جانے کی تیاری میں مصروف تھا۔ اور ہاں' یہ رہے وہ خطوط! تمہارے ہی لکھے ہوئے ہیں نہ یہ سب؟"

بہت غور سے بھابی نے ایک بار اُن خطوط کی طرف دیکھا اور ایک دو خط اٹھا کر پڑھے بھی اور پھر کچھ سوچتے ہوئے اس انداز سے بولیں جیسے انھیں کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی ہو۔

"جی ہاں پتا جی' یہ خطوط میں نے اپنی ایک سہیلی اُما کو لکھے تھے اس

ذلیل کی بیہودہ حرکتوں کے باعث اُسے کالج چھوڑنا پڑا اُس بے چاری کو اپنے جال میں پھنسا کر مجھ پر ظلم کرنے میں یہ اُس سے مدد لینا چاہتا تھا کالج چھوڑنے کے بعد اُس نے خط کے ذریعہ مجھ سے معافی مانگی تھی اور محض اُس کی تسلّی کی خاطر میں نے یہ خطوط اُسے لکھے تھے۔

"رمیش بولا" یہ خطوط ایک عورت کے لکھے ہوتے ہیں اور وینا نے لکھے ہیں لیکن یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک عورت کو ہی لکھے گئے ہیں؟"

"یہ خطوط میں نے انگریزی میں لکھے تھے یہ نہ بھولئے گا" بھابی کہنے لگیں" اور انگریزی میں کیا ایک سہیلی کو ڈیر، مائی ڈیر کے لفظوں سے مخاطب نہیں کیا جاسکتا۔ آپ ہی سے پوچھتی ہوں میں۔ آپ تو بی۔ اے آنرز ہیں۔ اگر خطوط میں والہانہ محبت کا اظہار کرنا ہو تو کس طرح مخاطب کریں گے آپ؟"

وینا بھابی کا یہ سوال سن کر میں خاموش ہو کر رہ گیا اور جواب نہ دے سکا۔

بھابی نے آگے بڑھ کر وہ خطوط رمیش کے ہاتھ میں دیدیئے۔

"کیوں بے لفنگے یہ سب خطوط تیرے پاس کیسے آئے؟ وہی پولیس والوں کا سارعب جماتے ہوئے رمیش کے سسر نے پوچھا۔

"اُملا سے مانگ لئے ہیں نے"۔

"یا چھل لئے تھے؟ سچ سچ بتا دے ورنہ تیری خیریت نہیں"

اُماکانت نے سر نیچے جھکا لیا۔

"اچھا اُس رات کو وینا سے تمھاری ملاقات کیسے ہوئی کیا پہلے ہی سے تم نے آپس میں طے کر رکھا تھا"

"جی نہیں، اچانک ہی ملاقات ہوگئی تھی۔ میں سینما دیکھ کر واپس گھر

آرہا تھا کہ سامنے سے آتی ہوئی یہ مل گئیں، یکایک زور سے بارش شروع ہوگئی اور یہ بارش سے بچنے کے لئے ایک طرف کھڑی ہوگئیں یہ اکیلی تھیں اُس وقت ........ رات کا وقت تھا.... میں بھی ان کے پاس پہنچ گیا اور .......؟

"اور رات کے وقت سونی سڑک پر ایک عورت کو تنہا دیکھ کر تو نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہہ ہ ہ" کہتے ہوئے وہ ایک دم اٹھ کھڑے ہوتے اور تڑاخ سے اُس کے منہ پر طمانچہ رسید کردیا اور بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے آسے رمیش کے نزدیک لاکر بولے "رجنی پور میں اس کی کمینی حرکت کے باعث اسے وینا نے جو سزا دی تھی شاید یہ بھول گیا ہے لیکن اس سزا کا نشان اس کی پیشانی پر اب تک موجود ہے" اور غصہ کے جوش میں انھوں نے اُسے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔

بھابی نے جو کچھ کہا تھا وہ بالکل سچ ثابت ہوا۔ ندامت سے میں نے سر جھکا لیا۔

اُما کانت ڈرتا ڈرتا اٹھا اور رحم طلب نگاہوں سے ہماری طرف دیکھتا ہوا ایک طرف کھڑا ہوگیا۔

رمیش کے سسر بولے "دنیا سے نیر العارف کیسے ہوا، تو ہمیشہ اسکے ساتھ جس بری طرح پیش آیا۔ جتنی مرتبہ تجھے معاف کیا گیا۔ سب باتیں تفصیل کے ساتھ سنا۔ ہمارے داماد صاحب وہ سب باتیں سننا چاہتے ہیں۔"

وہ ادھ مرا ہو چکا تھا۔ بات کرنی اسے دشوار معلوم ہو رہی تھی لیکن پھر بھی رک رک کر اُس نے جو باتیں سنائیں وہ بالکل وہی تھیں جو بھابی سنا چکی تھیں۔ ان میں ذرا بھی کمی بیشی نہ تھی۔

"اُما کانت اس مرتبہ بھی تیرے چچا کی حالت پر رحم کھا کر تجھے معاف کرتا ہوں، ورنہ تیرے خلاف میرے پاس وہ ثبوت موجود ہیں جن کے ذریعہ تین چار سال کے لئے تجھ سے چکی پسوانا میرے لئے کوئی مشکل نہیں! پھر کبھی تو تو ایسی حرکت نہ کرے گا؟ ......... جا یہاں سے!"

اور اُما کانت بلی کی طرح دم دبا کر وہاں سے ایسا بھاگا کہ بس نہ پوچھئے۔

"مسٹر امراب تو آپ کو کسی قسم کا شبہ نہیں رہا" سوال تو انھوں نے مجھ سے کیا تھا لیکن ان کا اشارہ تھا رمیش کی طرف۔

"یہ سب تو ٹھیک ثابت ہوا لیکن اُس دن آنی رات کو..."

رمیش بول پڑا۔

"سمجھ گیا میں، وہ بات بھی صاف ہو جائے گی اور میں اُسی وقت یہاں سے جاؤں گا" رمیش سے اتنا کہہ کر میری طرف مڑ کر وہ بولے "مسٹر امر چار پانچ دن تک میرا یہاں قیام رہے گا۔ کچھ اور کام بھی ہیں مجھے۔ سوچا جب یہاں آیا ہوں تو کیوں نہ اُن سے نمٹ لوں۔ جب تک میں یہاں ہوں آپ شام کے وقت یہاں ضرور آیا کریں۔ سنا ہے آپ شطرنج کے ایک ہی کھلاڑی ہیں۔ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو......"

مجھے شطرنج کھیلنے کا شوق ہے، شاید اس بارے میں رمیش نے ہی ان سے کہا تھا۔

"تکلیف کا ہے کی؟ آج کل تنہا ہی ہے یہ" ہنس کر شرارت سے رمیش نے کہا۔

اُس دن سے رات کو میں رمیش کے یہاں سونے لگا۔

رمیش کے سسر شطرنج کے بہترین کھلاڑی تھے۔ بارہ بارہ ایک ایک

بچے تک ہماری بازیاں جمی رہتیں۔ بہت ہی خوش مذاق آدمی تھے وہ! دو تین دن میں ہی میں اُن سے گھل مل گیا۔

پانچویں یا چھٹی رات کو شطرنج سے فارغ ہوکر میں ابھی سویا ہی تھا کہ رمیش نے آکر مجھے جھنجھوڑ دیا۔ میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا کہ وہ فوراً ہی میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے گھسیٹتا ہوا باہر لے چلا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کیونکہ جیسے ہی ہم باہر نکلے تو میں نے دیکھا کہ ہم سے کچھ فاصلے پر دینا بھابی اور اُن کے پیچھے پیچھے پتا جی چلے جا رہے تھے۔

چاندنی رات تھی۔ راستہ بالکل صاف تھا۔ ہم جلدی جلدی قدم بڑھاتے ہوئے اُن کے پاس جا پہونچے۔ لیکن دینا بھابی اپنی دُھن میں مست چلی جا رہی تھیں۔ اِدھر اُدھر اُن کا مطلقاً دھیان نہ تھا۔ کچھ دور جا کر بھابی یک لخت رُک گئیں اور حیرت زدہ سی اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔

ہم سب کو دیکھتے ہی وہ چونک پڑیں اور کچھ جھینپ سی بھی گئیں لیکن رمیش سے آنکھیں چار ہوتے ہی وہ مسکرا دیں۔ رمیش بھی مسکرا دیا۔

پتا جی آگے بڑھ کر بھابی کا ہاتھ پکڑ کر غصے سے بولے اس کمبخت سے ہزار مرتبہ کہا ہوگا کہ سوتے وقت سامنے کے دروازے پر قفل لگا لیا کر! . . . . . اگر تجھ سے نہ ہو سکے تو کسی ملازم سے کہہ دیا کر مگر اس نے آج تک اس پر عمل نہیں کیا۔ بڑوں کا کہا نہ ماننے سے دوسروں کو شک کرنے کا موقع ملتا ہے اور پھر سب کو پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔"

میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ رمیش کی طرف میں نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ منہ بنا کر وہ صرف ہنس دیا۔

"اسی عیب کے باعث رجنی پور میں اُس کی شادی نہ ہو سکی جان بوجھ

کرہی ہیں نے یہ بات اب تک رمیش سے چھپا رکھی تھی۔"

میں اب بھی کچھ نہ سمجھ سکا۔ بھابی اور رمیش شرارت سے میری طرف دیکھ کر ہنس دیئے۔ میں جھنجھلا اٹھا۔ آخر یہ کیا حماقت ہے؟

میرے کاندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر رمیش بولا۔" امر اُس رات کو بالوجی نے مجھے یہ بتا دیا تھا لیکن ثبوت کے طور پر یہ حالت دیکھنی ضروری تھی سو آج دیکھ لی۔"

"ثبوت کے طور پر یہ حالت؟ میں کچھ نہیں سمجھا رمیش صاف صاف کہو۔"

"ارے تمہاری بھابی کو نیند میں چلنے کی عادت ہے سمجھے۔"

سنتے ہی میں بے اختیار ہنس پڑا۔

# دل ہی تو ہے

"پریما!" رییش نے پیچھے سے آواز دی۔

اُس نے اُسے مُڑ کر دیکھا ـــــ دیکھا اور جلدی سے اپنے قدم آگے بڑھانے چاہے لیکن رییش اُس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اب اُس کے لئے بھاگنے کی کوئی راہ نہ رہ گئی تھی۔

"پریما! تم اب مجھ سے اتنی کھنچی کھنچی کیوں رہتی ہو؟ میرے سامنے آتے ہوئے کیوں گھبراتی ہو؟"

پریما نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شرمیلی نگاہوں سے اُسے ایک نظر دیکھا اور سر جھکا لیا۔

"کیا چچی کی وہ بات سن کر؟" رییش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پریما شرم سے سمٹ گئی۔

"بولو!" رییش نے اصرار کیا۔

پریماَ نے مُنہ پھیر لیا۔

"اچھا یہ تو بتاؤ ، اچی نے جو کچھ کہا ہے وہ ٹھیک ہے نہ ؟"

اس مرتبہ بھی اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور وہ جانے لگی۔

"ٹھہرو ابھی !" رمیش نے دونوں بازو پھیلا کر اُسے روکتے ہوئے کہا ——— "بتادو ، تب جاسکتی ہو۔"

"نہیں ۔" اُس نے قدرے غصے سے جواب دیا۔ لیکن اُس کے غصہ میں اصلیت نام کو بھی نہ تھی۔

"اب تم جاسکتی ہو ، جاؤ !" اُس نے کہہ تو دیا۔ مگر دل کے درد کو نہ چھپا سکا۔ اُس کے چہرے پر اُداسی اور مایوسی جھلک اُٹھی۔

لیکن پریما وہاں سے نہ ہٹی ، اُس نے رمیش کے چہرے پر اداسی اور مایوسی دیکھی اور دیکھتی رہ گئی۔

"جاؤ نہ ! مجھے اب تم سے کچھ نہیں پوچھنا ہے ۔" اور رمیش جانے لگا۔

پریما خاموش کھڑی رہی۔ اور رمیش بھی تو وہاں سے جا نہ سکا۔

"تم نے سچ نہیں کہا ؟"

"نہیں !" اور پریما مسکرا دی۔

"تو ؟" رمیش کے چہرے پر رونق آگئی۔

"تو کیا ؟ کچھ نہیں !" پریما پھر مسکرائی۔

"پھر وہی بات !" رمیش نے منہ بنالیا۔

"سچ سچ کہوں ؟ سچی بات سن سکو گے ؟ سن کر دل کو قابو میں رکھ سکو گے ؟" پریما نے غمگین ہو کر کہا۔ "امیروں کے پاس دل نہیں ہوتا اور ....."

"اچھا تو یہ بات ہے ۔" رمیش نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "اُن کے

دل کی جگہ خالی ہوتی ہے ؛ یہی تم کہنا چاہتی ہو نہ ؟“

پریما زیرِ لب مسکرائی۔ بولی ”ہاں، اُن کے دل کی جگہ خالی ہوتی ہے دل کے بدلے وہاں کبھی سونے چاندی کے کچھ سکّے اور کچھ زیورات رکھے ہوتے ہیں“ اور وہ ہنس پڑی ”تم نہ مانو تو نہ مانو لیکن میں اچھی طرح جانتی ہوں۔“ رمیش کو چڑانے میں اُس نے مسرت سی محسوس کی ”اسی لئے ہیں، تم سے ڈرتی ہوں“ اُس نے کھلکھلا کر ہنسنا چاہا لیکن رمیش کے چہرے کا بدلتا ہوا رنگ دیکھ کر وہ رُک گئی۔

رمیش کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

”تم بُرا مان گئے ؟“ وہ تاسف بھرے لہجہ میں بولی ”مجھے معاف کرو! غلطی ہوئی“ کہتے کہتے پریما کی آواز میں لرزش سی پیدا ہو گئی۔

رمیش خاموش کھڑا رہا۔

”رمیش بابو!“

اُس کے لہجہ میں پیار تھا، رمیش کا دل پگھل گیا۔

”تو سچ سچ بتاؤ؟“ اُس نے پوچھا۔

”سچ سچ!“ پریما شرما گئی۔ اُس کے رخساروں پہ حیا کی سرخی دوڑ گئی ”تم مجھے ابھی تک سمجھ نہیں سکے، رمیش ؟ ........ مجھ غریب کے لئے تو یہ پیام مسرت و راحت ہے!“ اور وہ مسرت کے نور سے جگمگاتی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔

رمیش کو جیسے کونین کی دولت مل گئی۔ پریما کا پریم ہی تو اس کے لئے سب کچھ تھا۔ جب وہ اُس کی ہے تو اُسے اور کیا چاہیئے۔ وہ خوشی کے مارے جھوم اٹھا۔

"اُداس کیوں ہو پریما؟" رمیش نے پوچھا۔

"نہیں تو۔" اُس نے چھپانا چاہا۔

"جھوٹ۔ تم چھپانا چاہتی ہو۔"

"تمہارا وہم ہے۔" اُس نے منہ پھیر لیا۔ اُس کی بڑی بڑی کٹورہ سی آنکھوں کی لانبی لانبی پلکوں پر آنسوؤں کی دو بوندیں ستاروں کی طرح جھلملا اُٹھیں۔

"یہ میرا وہم نہیں، بلکہ تمہارے چہرے پر چھائی ہوئی اداسی تمہاری پریشانی کا اظہار کر رہی ہے پریما، مجھے نہیں بتاؤ گی؟" رمیش نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے لجاجت سے کہا۔

ایک ہلکا سا سانس لے کر پریما بولی۔ "آج چچا کہیں بر دیکھنے گئے ہیں۔"

"یہ بات ہے! پھر چچی نے مجھ سے کیوں کہا؟ کیا وہ میرے ساتھ مذاق کر رہی ہیں؟" رمیش کی بھنوؤں میں بل پڑ گئے۔ "اچھا، میں پوچھوں گا تمہارے چچا سے۔"

تیسرے دن پریما کے چچا جگدیش بابو گھر واپس لوٹے، اُنہیں حسب منشا بر نہ ملا۔ کہیں بر ٹھیک ملا تو گھر ٹھیک نہیں اور اگر کہیں گھر ٹھیک ملا تو بر ٹھیک نہیں۔ جہاں دونوں ٹھیک تھے وہاں جہیز کا سوال تھا۔ جگدیش بابو ایک سیدھے سادھے آدمی تھے اور میونسپلٹی کے دفتر میں معمولی کلرک تھے۔ گھر میں بیوی اور ایک بھتیجی پریما کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ پریما عالم طفولیت میں ہی یتیم ہو گئی تھی، جگدیش بابو نے ازراہ ترحم اسے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اور اب جبکہ وہ جوان ہو گئی تو جگدیش بابو کو اُس کی شادی کی فکر ہوئی۔ لیکن اس فکر سے نجات حاصل کرنا اُن کے لئے آسان نہ تھا۔

ایک دن وہ اپنے مکان کی بیٹھک میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ اُنکے چہرے پر اُداسی اور پریشانی کی نمایاں جھلکیاں انکار کے بوجھ کی مظہر تھیں۔ کہ

رمیش اندر داخل ہوا۔ اور نمستے کرکے اُن کے سامنے پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

جگدیش بابو کچھ سوچنے میں بے حد منہمک تھے۔ "نمستے" سنتے ہی وہ چونک اُٹھے۔ "کون؟ اوہ! رمیش تم ہو۔ آؤ بیٹھو! کہو، کیسے آتے؟"

"یونہی!" رمیش بولا۔

تھوڑی دیر تک تو ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اسی اثنا میں رمیش نے چاہا کہ وہ اپنے آنے کا مقصد بیان کرے لیکن شرم و لحاظ کے باعث اُسکی زبان پر تالے پڑ گئے۔ مگر چونکہ وہ آیا اسی ارادہ سے تھا، اس لئے وہ کوشش کرکے اپنے ارادہ میں کامیاب ہو ہی گیا۔

"پریما کا بیاہ کہاں طے ہوا، چاچاجی؟"

"ابھی تو کہیں بھی نہیں ہوا بیٹا، غریبوں کو کون پوچھتا ہے آجکل؟" انہوں نے ایک آہ بھری اور حقے کو نیچے رکھ دیا۔

"کیوں؟ وہ تو پڑھی لکھی ہے۔ سمجھدار ہے اور ساتھ ہی..... ساتھ ہی خوبصورت بھی ہے۔" کہہ کر رمیش کچھ شرما سا گیا۔

"لیکن اُس میں ایک سب سے بڑا عیب ہے، غریبی! یہ کیا کم ہے؟ اِس دنیا میں چاندی کے ٹکڑوں کی جو قیمت ہے وہ لڑکی کے سمجھدار اور خوبصورت ہونے کی نہیں!" چاچاجی نے چبھتے ہوتے لہجہ میں کہا۔

"ایسا نہ کہیں، ابھی دنیا سے ہیرے کو پرکھنے والے ختم نہیں ہوتے! آپ مایوس کیوں ہوتے ہیں؟"

"منہ سے کہہ دینا آسان ہے اور کر دکھانا مشکل! اگر تم سے یہی سوال کیا جائے تو تم بھی وہی جواب دو گے جو اور لوگ دے چکے ہیں۔ رمیش! دنیا دولت

کی بھول کی ہے۔"

"چاچاجی، آپ مجھے ایسا نہ سمجھیں! میں تو جان و دل سے تیار ہوں، بشرطیکہ آپ حکم دیں۔" اور اُس کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔

"رمیش! تم واقعی سینے میں ایک بہت بڑا دل رکھتے ہو اور جو چاہو کر سکتے ہو، لیکن تم سے تمہارے ماتا پتا کے حقوق بھی تو وابستہ ہیں، اُن کی مرضی کے بغیر تمہیں کچھ بھی نہیں کرنا چاہیے۔ پہلے اُن کی مرضی دیکھو۔"

"وقت آنے پر یہ بھی ہو جائے گا۔ فی الحال آپ مجھ پر اعتبار کریں میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ......"

"ٹھہرو، رمیش!" چاچاجی نے بات کاٹ کر کہا۔ "جلد بازی اچھی نہیں ہوتی۔ دنیا میں رہ کر دنیا کے خلاف قدم اٹھانا عقلمندی نہیں۔"

"یہ ٹھیک ہے، لیکن اس دنیا کے خلاف قدم اٹھانا ہی پڑے گا چاچا جی! پانچوں انگلیاں ایک سی نہیں ہوتیں۔ آپ مجھ پر اعتبار کریں۔"

"رمیش مجھے تم پر اعتبار ہے لیکن اس دنیا پر اعتبار نہیں۔ یہ دنیا جھوٹی ہے، اِس دنیا میں فریب کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ یہاں دولت کے ڈھیر میں چھپا ہوا کوڑا تو نعمت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن گدڑی میں چھپا ہوا لعل مفلسی کے پھٹے پرانے چیتھڑوں میں چھپی ہوئی ہیرے کی کنی ایک لعنت سمجھی جاتی ہے۔ تم ایک دولتمند باپ کے بیٹے ہو، دولت کا غربت سے کیا واسطہ؟ کہاں سر کا تاج اور کہاں پاؤں کی جوتی! پہلے اپنے پتاجی سے پوچھ لو، پھر کوئی بات کرنا۔"

وہ اُداس ہو گئے۔ غم و فکر کے تھپیڑوں نے ان کے لہجے میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ رمیش کا دل بھر آیا۔ ایک ٹھنڈی سانس لے کر اُٹھا اور گھر لوٹ آیا۔

رمیش اپنے کمرے میں بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اچانک نوکر نے آکر اُسے اطلاع دی کہ ڈرائنگ روم میں پتاجی اور کچھ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں اور تمہیں بلا رہے ہیں۔ سنتے ہی رمیش نے کتاب ایک طرف رکھ دی اور ڈرائنگ روم میں پہنچ کر، ہاتھ جوڑ کر سب لوگوں کو نمستے کی اور ایک طرف سر جھکا کر کھڑا ہو گیا وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ لوگ کس لئے آئے ہیں؟ اُنہی لوگوں میں سے ایک نے اُسے بیٹھنے کے لئے کہا۔ اور وہ اُسی کے پاس ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس نے اُس سے پوچھا "یہ آپ کا ایم۔ اے کا فائنل ایر ہے نا؟"

"جی ہاں" رمیش نے جواب دیا۔

"آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

"ابھی کچھ فیصلہ نہیں کیا" رمیش نے نظریں اوپر اٹھائیں۔

رمیش کے پتا اپنے برابر والی کرسی پر بیٹھے ہوئے ایک ادھیڑ عمر کے آدمی سے باتیں کرنے میں بے حد منہمک تھے۔

"پھر بھی تو کچھ سوچا ہو گا؟"

"میں آئندہ کے لئے پہلے سے پریشان ہونا ٹھیک نہیں سمجھتا"

وہ ہنسا۔ "کچھ پریشان سے دکھائی دے رہے ہو!"

"معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے" برابر والی کرسی پر بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے تائید کی۔

رمیش چڑ سا گیا۔

"خیر چھوڑو اس قصہ کو، ہاں تو جب آپ گھریلو زندگی اختیار کرینگے تو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا آپ کو"

"گھریلو زندگی" رمیش زیر لب مسکرایا "ابھی گھریلو زندگی اختیار کرنیکا

میرا کوئی ارادہ نہیں ہے، میں ابھی کچھ عرصہ اس جھنجھٹ سے آزاد رہنا چاہتا ہوں۔"

"گویا گھریلو زندگی ایک قسم کی قید ہے۔"

"اس میں کیا شک ہے۔" رمیش نے محض چڑانے کی غرض سے کہا۔

"چاچا جی کچھ اور بھی سنا؟ ان کے خیالات تو کچھ اور ہی ہیں۔"

"کیا ہے راجندر؟" رمیش کے پتاجی نے پوچھا۔

"شادی کے مخالف ہیں اور گھریلو زندگی کو قید تصور فرماتے ہیں آپ!"

"رمیش تمہارا بچپن ابھی تک نہیں گیا۔ گھریلو زندگی کو تم قید سمجھتے ہو، پڑھ لکھ کر بھی کچھ نہیں سمجھے۔ خیر، مگر تم اس قید سے بچ نہ سکو گے۔ ہم تمہاری شادی کر کے ہی رہیں گے۔" رمیش کے پتاجی نے ہنس کر رمیش سے کہا اور پھر راجندر کی طرف مخاطب ہو کر بولے۔"اس کی باتوں کا کچھ خیال نہ کرنا ابھی اسے گھریلو زندگی سے واسطہ نہیں پڑا۔ اور جب واسطہ پڑ گیا۔ تو گھریلو زندگی کا ہو کر رہ جائے گا۔ تم اطمینان رکھو، یہ شادی ہو گی اور ضرور ہو گی۔"

راجندر مطمئن ہو گیا اور پھر سب لوگ چلے گئے۔

جب سب چلے گئے تو رمیش کے پتاجی نے رمیش سے کہا۔"پاگلوں کی سی باتیں چھوڑ دو۔ اب کچھ عقل سیکھو۔"

رمیش چپ چاپ سنتا رہا۔

"آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

رمیش چاہتے ہوئے بھی نہ بول سکا۔

"بولو! جواب دو۔"

"جی میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔"

"کیوں؟ کیا تم پر بھی آجکل کا بھوت سوار ہو گیا ہے؟"

"ابھی نہیں کرنا چاہتا۔" آہستہ سے بولا۔

"آخر کب کرو گے؟"

"وقت آنے پر خود ہی عرض کر دوں گا۔"

وہ جلدی سے وہاں سے چلا گیا، اور رگھوبر داتے حیرت زدہ سے ہو کر رہ گئے۔

---

گرمیوں کے دن تھے اور دوپہر کا وقت۔ رمیش وقت گذارنے کیلئے انگریزی کا ایک ناول پڑھ رہا تھا۔ اچانک دروازے پر کسی نے دستک دی۔ ناول اُس نے ایک طرف رکھ دیا۔ اور اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ دستک دینے والا کوئی اجنبی تھا۔ اُس نے نمستے کرتے ہوئے رمیش سے پوچھا۔ "آپ ہی رمیش رائے ہیں؟"

ایک خط دیتے ہوئے اجنبی نے کہا: "میں جگدیش بابو کا پڑوسی ہوں۔ اُنکے گھر سے یہ خط بھیجا گیا ہے۔" اور وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کر کے جانے لگا۔

"ذرا ٹھہریئے تو، آپ کا شبھ نام؟"

"میرا نام ........ برج کشور ہے اور چوک میں کپڑے کی دُکان ہے میری۔"

وہ چلا گیا۔

رمیش نے لفافہ کھولا۔ خط پریما کا تھا۔ اُس نے لکھا تھا:۔

"رمیش!

چاچاجی کی طبیعت اچانک بہت خراب ہو گئی ہے اگر کوئی

ضروری کام نہ ہو تو فوراً ہی ڈاکٹر کو لے کر چلے آؤ۔ گھر
میں ہم تینوں کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ جتنی بھی جلدی
ہو سکے ضرور آؤ۔ ایک تم ہی ہو جو اس آڑے وقت میں
کچھ امداد کر سکتے ہو۔"

پریما"

رمیش خط پڑھتے ہی سائیکل لے کر گھر سے باہر نکل گیا۔ اور بہت جلد ایک
ڈاکٹر کو لے کر پریما کے گھر پہنچا۔

دروازہ کھولتے ہوئے پریما بے چینی سے بولی :۔" رمیش !"

"گھبراؤ نہیں پریما! اب تو آ ہی گیا ہوں۔" رمیش نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔
پریما کے چاچا جی بستر پر پڑے ہوئے تھے اور بدبو کے مارے کمرے
میں ناک نہیں دی جا رہی تھی۔ انہیں ہیضہ ہو گیا تھا۔ چاچی ان کی پائینتوں میں
فرش پر روئی سی بیٹھی تھیں۔

ڈاکٹر نے معائنہ کیا اور چپ چاپ کمرے سے باہر نکل آیا۔ کیس بہت خراب
تھا جگدیش بابو کی زندگی خطرناک صورت اختیار کر چکی تھی، اُن کے بچنے کی کوئی امید
نہیں تھی۔

اور یہی ہوا۔ شام ہوتے ہوتے اُن کی حالت بہت زیادہ خراب ہو گئی۔
پریما اور چاچی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے
لگیں۔ رمیش نے تسلی دی لیکن اُن کے آنسو نہ تھمنے تھے نہ تھمے۔

"سُبھدرا!" چاچا جی نے کراہتے ہوئے آواز دی۔
چاچی اُن کے اوپر جھک گئیں۔ اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پوچھا۔
"طبیعت کیسی ہے اب؟"

"طبیعت ؟" چاچاجی خاموش ہو گئے۔

چاچی کی آنکھوں سے آنسو جھڑتے رہے اور پریما کھڑی سسکتی رہی۔

"پریما!" چاچاجی کی دھندلی آنکھوں میں آنسو جھلملا اٹھے۔

"بیٹی!" حسرت بھرے لہجہ میں کہا اور خاموش ہو گئے۔

"پریما کو کس پر چھوڑے جا رہے ہو سوامی؟" چاچی وہیں پر سر رکھکر رو پڑیں۔

"کیا بتاؤں؟" چاچاجی نے کروٹ بدل لی۔

رمیش بہت دیر سے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن نہ روک سکا آنکھوں سے آنسو پھوٹ نکلے۔

"چاچاجی!" وہ صرف اتنا کہہ سکا۔

"کون، رمیش بیٹا؟" چاچاجی کی آنکھوں میں جیسے روشنی آگئی ہو۔ "تم آگئے؟"

"میرے لئے کوئی حکم چاچاجی؟" رمیش نے اُن کے نزدیک جاکر کہا۔

چاچاجی نے اُسے آرزومندانہ نگاہوں سے دیکھا۔ پھر پریما کو دیکھتے ہوئے بولے: "اس کا خیال رکھ سکو گے۔ میں اِسے تمہارے سپرد کرتا ہوں۔"

"میں آخری سانس تک اس کا خیال رکھوں گا چاچاجی، آپ مجھ پر اعتبار کریں۔" رمیش نے "وچن" دیا۔

"شبھدرا!" چاچی سے مخاطب ہو کر بولے: "میں اب آرام سے مر سکوں گا۔ شبھدرا، تم روتی کیوں ہو؟" اُن کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "شبھدرا ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا۔"

وہ اب تھک گئے تھے۔ اُن کی سانس اب اکھڑی اکھڑی سی چل رہی تھی۔ چاچی آنچل سے منہ چھپائے رو رہی تھی۔ پریما ٹکٹکی لگائے چاچاجی کی طرف دیکھ رہی

تھی اور آنسوؤں سے اُس کے رخسار بھیگ رہے تھے۔

اچانک جگدیش بابو کو قے ہوئی۔ وہ اُٹھ کر پٹی پر جھکے، اُن کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اور آنکھیں اوپر کو ٹنگ کر ساکت ہوگئیں۔ چاچی نے اُن کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اور بے سُدھ ہو کر اُن کے اوپر جھک گئیں۔ پریما دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ رمیش مبہوت و ساکن آنکھیں پھاڑے کھڑا رہ گیا۔

پنجرے کو توڑ کر پنچھی اڑ گیا تھا۔ سونے پنجرے کو دیکھ کر بدنصیب چاچی اور پریما کے ہردے ہاہاکار کر اٹھے۔ اسی سے تو ان کی زندگی روشن تھی۔ اُسی سے تو اُن کی دنیا بہار آفریں تھی۔ اُن کا سہارا جاتا رہا۔ اُن کی خوشیوں کا ناٹک ختم ہوگیا۔

---

بیوی کی بات سن کر رگھوبر راتے چونک اُٹھے۔ اتنا کچھ ہوگیا۔ اور وہ کچھ بھی نہ جان سکے۔ انھیں خواب میں بھی اپنے بیٹے سے ایسی امید نہ تھی۔ غصہ کے مارے اُنکی آنکھیں سرخ ہوگئیں گرجتی ہوئی آواز میں انہوں نے پکارا "رمیش!"

رمیش گھر میں موجود نہ تھا۔ رگھوبر راتے خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے۔

شام کو جب رمیش گھر واپس آیا تو رگھوبر راتے نے اُسے اپنے پاس بلا کر پوچھا "یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ ...... پریما سے تمہارے تعلقات کیسے ہیں؟"

رمیش چپ رہا۔

"کہتے کیوں نہیں؟ کیا یہ سب کچھ سچ ہے؟ اور کیا یہ ٹھیک ہے کہ تم آجکل اُس کے گھر بہت آتے جاتے ہو؟"

"جی ہاں، یہ سب سچ ہے۔" اُس نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی اور یہ میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ کہ تم ایک آوارہ لڑکی سے تعلقات قائم کر کے اپنے خاندانی وقار کو بٹہ لگاؤ گے۔"

رمیش نے ہمت کر کے کہا۔" وہ آوارہ نہیں ہے پتاجی! میں اُس کے چاچا جی کو" وچن" دے چکا ہوں کہ میں اُسی سے شادی کروں گا۔"

"چپ رہو' زیادہ باتیں بنانے کی ضرورت نہیں۔ خاندانی وقار کو بٹہ لگانے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ اُس کی ماں کیسی تھی جانتے ہو وہ اچھے کیرکٹر کی نہیں تھی یہ لڑکی اس کے ناجائز تعلقات کا زندہ ثبوت ہے۔ چھی! ایسی لڑکی سے کون شادی کرے گا۔" پھر وہ بیوی سے مخاطب ہو کر بولے " جان بوجھ کر مکھی نگلی نہیں جاتی ــــ رمیش تم سمجھدار ہو' سوچو' سمجھو۔"

ڈگمگاتے ہوئے پیروں سے رمیش اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا' پریما کی ماں بدچلن عورت تھی اور پریما اپنی ماں کے ناجائز تعلقات کی پیدائش ہے' لیکن اگر یہ ٹھیک ہے تو پریما نے نہیں اسکے چاچا نے اُسے دھوکا دیا ہے۔ دھوکے باز' فریبی! وہ دھم سے پلنگ پر اوندھے منہ گر پڑا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی ندی بہہ اُٹھی۔

---

رمیش اپنے کمرے میں بیٹھا پریما کا خط پڑھ رہا تھا۔ سامنے میز پر پریما کی تصویر مسکرا رہی تھی۔

خط میں لکھا تھا۔

"رمیش!

میرے رنگین خوابوں کی دنیا اجڑ گئی۔ میری زندگی کے رومان اندر ہی اندر دفن ہو کر رہ گئے۔ تم' جسے اپنا سمجھے ہوئے تھی' غیر ہو گئے۔ میں بدنصیب تمہارے چرنوں تک پہونچ کر بھی تمہارے چرن نہ چھو سکی۔ میں نے ریت کا ایک محل بنانا چاہا۔ یہ

میری نا سمجھی تھی' میرا پاگل پن تھا' اس کی تو ایک لمحہ بھی نہ ٹھہر سکی۔ ہوا کے ایک جھونکے سے ہی ختم ہو کر رہ گیا۔ اور نشان تک ، بھی باقی نہ رہا۔

چاچا جی کی موت کے بعد ایک تمہارا ہی سہارا تھا' اب وہ بھی نہ رہا۔ زندگی مرجھا گئی۔ جس روشنی میں' سکون و مسرت ڈھونڈ رہی تھی' اسے تاریکی نے اپنے دامن میں لے کر میری قسمت کو تاریک کر دیا۔

پتا جی کو میں نے دیکھا ہی نہیں۔ ماتا کی محبت بھری گود سے بھی پوری طرح لطف اندوز نہ ہو سکی۔ چاچا جی کے رحم اور چاچی جی کی ممتا نے میری پرورش کی۔ اور جب میں نے جوانی کے شورش میں قدم رکھکر اپنے دل میں محبت کی شمع روشن کی تو تم نظر آئے' اور میں نے اپنا سب کچھ تمہاری نذر کر دیا۔

پھر؟ پھر زندگی کا ہر لمحہ محبت سے مسکرا اُٹھا۔ تم نے مسرتوں کی بارش کر دی۔ وہ حسین لمحات بھولے نہیں جا سکتے۔

سکھ ؟ سکھ بھی کہیں ٹھہر سکا ہے ؟ سکھ بھی کہیں سچا اترا ہے وقت کی کسوٹی پر وہ ہمیشہ کھوٹا ہی ثابت ہوا ہے لیکن اُسکے باوجود انسان اسی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے' دکھ سے کوسوں دور بھاگنے کی کوشش کرتا ہے لیکن دکھ پیچھا نہیں چھوڑتا۔

میری زندگی اب دکھی ہو چکی ہے۔ دُکھ کے بعد سکھ کی جھلک نظر آئی تھی لیکن بدنصیبی نے پوری طرح لطف اندوز نہ ہونے دیا۔ پھر وہیں لا پھینکا جہاں' میرا جہاں کا ٹمیر تھا۔ رمیش! میرے سپنے

میں جوالا مکھی سلگ اُٹھی ہے کہہ نہیں سکتی کہ یہ جوالا پھوٹے گی اور کب سب کچھ جل کر خاک ہو جائے گا۔ ابھی تو جل کر جھلس کر ہی زندگی کے دن پورے کرنے ہوں گے اور گذشتہ واقعات کو دل سے فراموش کرنا ہوگا۔ لیکن کیا تمہیں بھلا سکوں گی؟

چاچی جی ہر وقت روتی رہتی ہیں۔ میں اُنہیں بہت سمجھاتی ہوں مگر کسی صورت بھی نہیں سمجھتیں، بس ہر وقت ہر لمحہ روتی رہی رہتی ہیں رو رو کر انہوں نے اپنی جان ہلکان کر لی ہے۔ آدھی بھی تو نہیں رہیں اگر یہی حال رہا۔ تو وہ وقت دور نہیں کہ یہ بھی ہمیشہ کیلئے میرا ساتھ چھوڑ دیں۔ اور آخر کب تک دیں گی؟ مجھے تو سب کچھ سہنا ہوگا، اس کے سوا اب چارہ بھی کیا ہے

میں ایک مشرقی لڑکی ہوں۔ جو سلا جل کر راکھ ہونا جانتی ہے مگر زبان کھولنا نہیں جانتی۔ آنسو پی کر مسکراتی ہے، آہ سحر کر ہنستی ہے۔ میں تو میں، ہوں مگر تم؟ تمہاری بات تو میں اب تک سمجھ نہیں پائی۔ تم نے مجھے کیوں بھلا دیا؟ تمہاری وہ محبت بھری نظر کیا ہوئی؟ آزاد مرد ہو، کوئی قید نہیں، کوئی رکاوٹ نہیں۔ تو کیا وہ محض دکھاوا تھا؟ دھوکا؟ جھوٹ؟ سب جھوٹ؟

اُف، میں کتنی بھولی ہوں، کچھ بھی تو نہ سمجھی اور تمہارے فریب میں آگئی ——— لیکن رمیش، اب میں تم سے زیادہ تمہارے فریب کو چاہنے لگی ہوں۔ اور اسی میں اُلجھ کر زندگی کے دن تیر کر رہی ہوں۔ میں خط تو نہیں چاہتی تھی۔ سوچا تھا کہ چپ ہی رہونگی لیکن دل نے آخر خط لکھنے پر مجبور کر ہی دیا۔ یہ میرا آخری خط ہے، اب

آئندہ کبھی نہ لکھوں گی۔ آخری پیغام

پریما"

رمیش نے خط پڑھ کر میز کی دراز میں رکھ دیا۔ آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو پونچھ کر پریما کی تصویر اٹھائی۔ ایک نظر اُسے دیکھا اور الٹا کر کے میز پر رکھ دی۔

---

کئی سال بعد ـــــ

جبکہ رمیش انڈین ایئر فورس میں "پائیلٹ" بن گیا تھا۔ اس عرصہ میں چاہتا تو وہ پریما کو بآسانی دل سے فراموش کر سکتا تھا لیکن وہ اُسے نہ بھول سکا۔ گذشتہ واقعات کی یاد اکثر تازہ ہو جاتی۔ اور وہ مضطرب و بے چین ہو جاتا۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اُس نے پریما کی زندگی کے ساتھ بہت بڑا ظلم کیا ہے جس کا کفارہ ادا کرنا اُس کے لئے بہت ضروری ہے اور اس کے لئے اُس نے خود کو تیار کر لیا۔ لیکن اُسکی کسی تدبیر نے اُس کا ساتھ نہ دیا۔ پریما نہ جانے کونسی دنیا میں چلی گئی تھی۔ اُسے بہتیرا ڈھونڈا۔ لیکن اُس کا کہیں بھی پتہ نہ چلا، آخر مایوس ہو کر بیٹھ رہا۔ مگر چین سے نہ بیٹھ سکا۔ پریما کے بغیر اُسے اپنی زندگی ایک بوجھ سا محسوس ہونے لگی، اور وہ زندگی سے کچھ بے پرواسا ہو گیا۔

انہی دنوں ملیریا کا زور تھا، رمیش بھی اس کے حملہ سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اور ملیریا کا شکار ہو کر فوجی ہسپتال میں پہنچ گیا۔

ایک دن موسم حد درجہ دلفریب تھا۔ لیکن ہسپتال کے اندر کی فضا کراہ رہی تھی۔ رمیش اپنے کمرے میں بستر علالت پر پڑا گھر کی یاد سے کھیل رہا تھا۔ اسے ایک ایسے ساتھی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی جو اُس کی تکلیف کو اپنی شیریں مسکراہٹ سے محو کر دے۔ اچانک اُس کی آنکھوں کے سامنے پریما آگئی۔ پریما ـــ کتنی نشاط

آفریں اور کتنی زندگی بخش تھی اُس کی مسکراہٹ! کاش وہ اس کے پاس ہوتی۔ اور یہ وہ بستر علالت پر پڑا ہوتا ـــــ پڑا ہوتا۔ اور وہ دوا کے ہر گھنٹے پر اپنی شیریں مسکراہٹ کا جام اُس کے ہونٹوں سے لگا دیتی ـــــ

اچانک اُسے کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی اور اُس کے خیالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

"گڈ ایوننگ سسٹر!" بمشکل مسکرا کر وہ بولا۔

لیکن سسٹر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ چہرے پر سرخی نام کو بھی نہ رہی، سفید ہو گئی! ایک ثانیہ کے بعد خود کو سنبھالتے ہوئے اُس نے کہا۔ "گڈ ایوننگ! کہیے کیسی طبیعت ہے؟"

رمیش نے اسے دیکھا اور دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ پریما اور اُس میں کوئی فرق نہ تھا۔ ٹکٹکی لگا کر دیکھتے ہوئے وہ بولا۔ "ویسا ہی ہوں! جسم میں درد ہے۔" اور وہ اسی طرح اُسے دیکھتا رہا۔

سسٹر میز پر سے اُس کا چارٹ اٹھا کر دیکھتے ہوئے بولی۔ "گھبرائیے نہیں، ملیریا بخار میں درد تو ہوتا ہی ہے۔ جلد آرام ہو جائے گا۔" اور وہ خاموشی سے ٹمپریچر لینے لگی۔

منہ سے تھرمامیٹر نکالتے ہی رمیش نے پوچھا۔ "کیا ہم پہلے بھی کہیں ملے ہیں؟"

"ہو سکتا ہے۔" اس نے اس سوال پر کوئی خاص توجہ نہ دی اور فوراً ہی بات کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا۔ "اور کوئی تکلیف؟"

"اور کوئی تکلیف نہیں ہے سسٹر! ....... بس تنہائی دیمک کی طرح اندر اندر کھائے جا رہی ہے۔"

میز پر سے اخبار اٹھا کر اُس نے رمیش کی طرف بڑھا دیا۔ بولی۔" یہ اس مرض کی دوا ہے" اور وہ زیر لب مسکرائی، پھر جلدی سے پردہ اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

رمیش کی آنکھوں میں پریما کا حسن جگمگا اٹھا۔ کتنی مشابہت ہے دونوں میں! ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سسٹر پریما کی سگی بہن ہے..... کہیں پریما ہی تو نہیں؟ نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کہاں وہ بھولی پریما اور کہاں یہ شوخ و چنچل سسٹر، اور وہ یہاں آ بھی کیسے سکتی ہے؟ اس نے کہیں اپنا بیاہ کر لیا ہوگا۔ وہ اس کے لئے کنواری تھوڑے ہی بیٹھی ہوگی۔

رمیش نے ایک آہ بھری۔ کروٹ بدل کر وہ اخبار پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن جلد ہی اکتا کر اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اُس کی آنکھوں کی پلکوں کے پیچھے سسٹر اور پریما اپنی محبت کے خواب بکھیر رہی تھیں۔

---

کئی دن گذر گئے مگر وہ نرس پھر اُس کے کمرے میں نہیں آئی۔ رمیش کی آنکھیں اُسے دیکھنے کے لئے بیقرار ہو اٹھیں لیکن دل ـــــ دل میں جگہ ہی کہاں تھی کہ وہ اس نرس کو جگہ دیتا۔ جس دل میں رہ رہ کر پریما کی محبت کروٹیں لے رہی تھی۔ جس کا ہر گوشہ پریما کے حسن کے نور سے جگمگا رہا تھا۔ وہ نرس کے لئے بیقرار کیوں ہو؟ اُس سے اُس کا کیا تعلق؟ مگر اُس کی آنکھیں اُسے کیوں دیکھنا چاہتی ہیں؟ اُس سے رشتہ قائم کرنے پر کیوں مُصر ہیں؟ کیا ان آنکھوں میں وفا نہیں رہی؟ وہ کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ لیکن سسٹر کی خوبصورتی نے تو اُس کی آنکھوں کو نہیں اپنایا۔ وہ تو صرف اُسے دیکھنا چاہتی ہیں۔ جس کے چہرے پر پریما کی دلفریب صورت مسکرا رہی ہے؟ جس کی خوبصورتی میں پریما کا حسن جمیل انگڑائیاں لے رہا ہے۔

اور جس کی خوبصورتی کی رعنائیوں میں پریما سر سے پاتک جلوہ افروز ہے۔ کتنی بے پناہ مشابہت ہے پریما اور سسٹر میں!

پلنگ پر لیٹے لیٹے وہ بے چینی سی محسوس کرنے لگا۔ کیا بات ہے سسٹر آتی کیوں نہیں؟

"کہیئے طبیعت کیسی ہے؟" اندر آکر سسٹر نے مسکرا کر کہا۔

"ویسی ہی ہے" رمیش نے جواب دیا۔

"دیکھوں!" اور اُس نے اُس کی کلائی تھام لی "اسوقت تو بخار نہیں ہے"

رمیش نے ایک آہ بھر کر کہا "مگر میں تو اب بھی سینے میں ایک آگ سی محسوس کر رہا ہوں"

"بخار اور سینے کی آگ دو متضاد چیزیں ہیں مسٹر رمیش!" سسٹر نے مسکرا کر کہا اور فوراً ہی بات کا رخ بدل دیا "اچھا اب آپ دوا پی لیجیے"

"طبیعت نہیں چاہتی سسٹر!" رمیش نے دوا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایک ثانیہ کے لئے طبیعت کو مجبور کر کے دوا پی لینا کوئی مشکل نہیں لیجیے" اور اُس نے دوا کا گلاس اُس کے منہ سے لگا دیا۔

دوا پی لینے کے بعد رمیش نے سسٹر سے پوچھا "آجکل لفٹیننٹ سسٹر یہاں کیوں نہیں آتیں؟"

"کون؟ سسٹر پریما؟ اُن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اُنہوں نے کچھ دنوں کی چھٹی لے رکھی ہے"

رمیش چونک اٹھا۔ وہ کچھ بول نہ سکا "سسٹر پریما" اُس کے کانوں میں جیسے کسی نے آب حیات ٹپکا دیا ہو۔ کلیجہ دھک سے ہو گیا، تو وہ پریما ہی ہے؟ اُس کی اپنی پریما!

"سسٹر! اُن کا نام کیا پر یملہ ہے؟ یہی تو آپ نے ابھی ......"

"ہاں، ہاں، اُن کا یہی نام ہے۔ مگر کیا آپ انھیں جانتے ہیں؟" سسٹر نے اُس کا دل ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔

"بہت پرانا تعارف ہے۔ مگر میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ کہ یہ وہی ہیں۔ ہوسکتا ہے کوئی اور ہوں۔ اچھا آپ اتنا بتا سکتی ہیں کہ وہ کہاں کی رہنے والی ہیں؟" رمیش اپنے اضطراب کو چھپا نہ سکا۔

"شاید..... شاید میرٹھ کی ہیں۔ مگر میں صحیح طور پر نہیں جانتی۔ اُن سے پوچھ کر بتا سکوں گی۔" اور اُس نے تاسف بھری نگاہوں سے رمیش کی طرف دیکھا۔ سسٹر جانے لگی تو اُس نے روک کر کہا۔ "اُن سے معلوم کرنے کی ضرورت نہیں، شاید وہ بُرا مانیں۔" پھر وہ ایک گہری سوچ میں پڑ گیا۔

وہ سوچنے لگا۔ پریما خادمہ بن بیٹھی۔ اُس نے وہی کیا۔ جو ایک بلند اخلاق عورت کر سکتی تھی۔ وہی اس کی زندگی کا آدرش تھا۔ محبت پر وہ قربان ہو گئی۔ اُس نے محبت کے بغیر زندگی کو ہیچ سمجھا..... سینے میں اس کا دل تڑپ اٹھا اُس نے اُس کے ساتھ کتنی ناانصافی کی۔ کیا وہ اتنی بڑی قربانی کر سکتا تھا؟ وہ اُس کا جیسا دلوانہ بن سکتا تھا؟ نہیں، رمیش کو اپنے سے نفرت ہونے لگی۔ اُس نے اپنا منہ تکیہ میں چھپا لیا۔

---

ہوا کے ایک ہلکے جھونکے کی طرح پریما کمرے کے اندر داخل ہوئی رمیش ابھی اٹھا نہ تھا۔ وہ گہری نیند میں تھا۔ پریما آگے بڑھی۔ میز پر سے چارٹ اٹھا کر دیکھا۔ اور پھر اُسے وہیں رکھ کر وہ رمیش کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ یہ وہی ہے جس نے ایک بار اُسے وچن دیا تھا۔ یہ وہی ہے جس نے

اُس کی زندگی میں خوشیاں بکھیر دی تھیں یہ وہی ہے جو ایک دن اُس کے جسم کے روئیں روئیں میں بس گیا تھا۔ آسمان کے دو بچھڑے ہوئے ستاروں کی طرح آج وہ پھر ایک دوسرے سے آ ملے ......... دل میں چھپے ہوئے محبت کے جذبات اُس کی آنکھوں میں امنڈ آئے۔ رمیش کے بکھرے ہوئے بالوں کو آہستہ سے سمیٹ کر اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ اُس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ وہ بے سُدھ سی کھڑی رہ گئی۔

رمیش جاگ اٹھا۔ مگر اپنی پیشانی پر کسی کا نازک ہاتھ دیکھ کر وہ آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ وہ جان گیا کہ وہ پریما ہی ہے۔

پریما نے کھڑے کھڑے وہاں شرم سی محسوس کی۔ شرمیلی نگاہوں سے اُس نے چاروں طرف دیکھا۔ اُن دونوں کے سوا وہاں کوئی نہ تھا۔ اُس کے پیلے رخساروں پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔ وہ سنکوچ سے بھر اٹھی۔ یہ کیا پاگل پن ہے؟ وفورِ حیا سے اُس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی ــــ

رمیش نے آنکھیں کھول دیں۔ شرم سے اُس نے اپنا سر جھکا لیا۔ کہیں وہ سمجھ تو نہیں گئے۔ اُف بھری گنگا پار کر کے بھی وہ کنارے پر آ کر ڈوبنے لگی۔ شرم کے مارے وہ سر نہ اٹھا سکی۔

"اوہ! سسٹر آپ!" رمیش نے جلدی سے اٹھ کر مسرور لہجہ میں کہا۔

"بہت دنوں کے بعد تشریف لائی ہیں آپ؟ یقین مانیے میں خواب میں آپ ہی کو دیکھ رہا تھا۔ صبح کے خواب اکثر سچے ہوا کرتے ہیں۔" اُس کے لہجہ میں مٹھاس تھی۔

"اچھا!" وہ ہنس دی۔

"آپ نے آنا کیوں چھوڑ دیا تھا سسٹر؟"

"چھٹی پر تھی۔"

"کیا کچھ طبیعت خراب تھی؟"

"جی، کچھ یونہی......" اُس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا اُسکے چہرے پر زردی چھا گئی تھی۔ ہونٹ سوکھ گئے تھے۔

"اوہ، آپ ابھی تک کھڑی ہیں، بیٹھئے نا، میں بھی کیسا ہو گیا ہوں۔"

اس اثنا میں پریما نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ بولی "آپ تو پہلے سے اب اچھے دکھائی دیتے ہیں۔ طبیعت میں بھی شگفتگی آتی جارہی ہے۔"

"ہاں اچھا کیوں نہ ہوں۔ جب آپ جیسی تیمارداری کرنے والیاں ہوں" اُس نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا

ہمت کر کے اُس نے ایک نظر رمیش کو دیکھا اور بولی "معلوم ہوتا ہے آپ ہماری خدمت سے خوش ہیں۔"

"یقیناً!" ایک چبھتی ہوئی نظر پریما پر ڈال کر وہ ہنسا۔ پھر اُداس ہو کر بولا۔

"ایک بات پوچھوں، سسٹر؟"

وہ گھبرا سی گئی۔

"آپ برا تو نہ مانیں گی؟" وہ اُس کے اڑتے ہوئے رنگ کو دیکھ رہا تھا۔ پریما کی روح کھنچ کر ہونٹوں پر آ گئی۔ کیا وہی ہونا چاہتا ہے جس سے وہ دور بھاگنا چاہتی ہے؟ زبردستی خشک ہنسی ہنستے ہوئے بولی "پوچھئے؟"

"آپ سچ سچ بتا سکیں گی؟"

"کوشش کروں گی۔"

چند لمحوں تک خاموشی چھائی رہی۔ دونوں کے دل تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ آنکھوں سے گھبراہٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔

پلنگ سے اترتا ہوا رمیش بولا "تم نے مجھے معاف کر دیا یا نہیں، پریما؟"

پریما کانپ اٹھی۔

"بولو پریما، کچھ تو بولو۔"

پریما دھم سے کرسی پر گر پڑی۔ دونوں ہاتھوں سے اُس نے اپنا منہ ڈھانپ لیا۔ اُس کی آنکھوں نے بھادوں کی بارش کر دی۔

"پریما؟" اُس کے لہجہ میں درد تھا۔ اُس کے قریب جا کر اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔ "بولو، کیا تم نے مجھے معاف نہیں کیا؟ اگر نہیں تو جو سزا چاہو دے سکتی ہو، میں سب کچھ برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں۔" اُس کی آواز مرتعش ہو اٹھی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی بوندیں ٹپ ٹپ فرش پر گرنے لگیں۔

پریما اپنی کمزوری پر نادم سی ہو گئی۔ وہ اتنی معمولی سی بات کو بھی برداشت نہ کر سکی۔ وہ کتنی کمزور ہے؟ مرد کے سامنے ابلا اور بھی اَبلا بن جاتی ہے۔

رومال سے منہ پونچھتی ہوئی وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ رمیش نے اُسے جاتا دیکھ کر اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر روکنا چاہا۔ آہستہ سے ہاتھ چھڑا کر وہ بولی۔ "آپ بھول رہے ہیں۔"

اب رمیش کے پاس کچھ باقی نہ رہا تھا۔ جیسے کسی راہزن نے اُسے لوٹ لیا ہو۔ پریما ہوا کے ایک جھونکے کی طرح کمرے سے باہر نکل گئی۔

ہارا ہوا رمیش تھک کر بستر پر گر گیا۔

---

"پریما، تم اب تک مجھے معاف نہیں کر سکیں؟" دل پر ایک بوجھ سا محسوس کرتے ہوئے رمیش نے کہا۔

"معافی کیسی؟ رمیش بابو؟ آپ نے ایسا کون سا گناہ کیا ہے؟" فرش کی طرف دیکھتے ہوئے پریما نے آہستہ سے کہا۔

"میں تو اس آگ میں جل رہا ہوں کہ تم نے مجھے معاف نہیں کیا۔ سنا کرتا تھا کہ عورتوں کے دل میں رحم کے جذبات زیادہ ہوتے ہیں مگر ۔۔۔۔"

بات کاٹ کر وہ ہنستی ہوئی بولی ۔" دل ؟ میرے پاس دل کہاں ؟ میرا دل تو پتھر بن چکا ہے ۔"

"غلط، میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں۔ تم اپنے آپ کو بھی نہیں جانتیں پہچانتیں۔ تم نہیں جانتیں کہ تم کیا ہو، کتنے پانی میں ہو!"

وہ ہنسی۔

"آپ بھولتے ہیں مسٹر رمیش، اب میں وہ نہیں رہی جو کبھی پہلے تھی۔ پہلے ناسمجھ تھی، بے وقوف تھی، دنیا کو دیکھا نہ تھا اسی لیے تو لوٹ لی گئی تھی۔ سنتی ہوں عورتیں چنچل ہوتی ہیں۔ لیکن یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ مرد سے زیادہ کوئی چنچل نہیں ہو سکتا۔"

"تم سب کچھ کہہ سکتی ہو، پریما۔ قصور میرا ہی ہے ۔" رمیش نے آنکھیں ندامت سے جھکا کر کہا۔

"یہ صرف ہماری ہی بات نہیں ہے، رمیش بابو، ساری ہی دنیا کی بات کہتی ہوں، ہر طرف میں نے یہی دیکھا ہے ۔"

"مجھے مجبور کر دیا گیا تھا ۔" رمیش نے صفائی پیش کی۔

"مجھے اچھی طرح معلوم ہے!" وہ گوشۂ مغرب میں ڈوبتے ہوئے آفتاب کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ۔" لیکن اب اس بھول بھلیاں میں پڑ کر کیا لو گے ؟ بھول جائیے، ہونے والی بات ہو کر رہتی ہے۔ اب اپنا اپنا مقصد ہمارے سامنے ہے، ہمیں اسے پورا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ جو گذر گئی۔ سو گذر گئی۔ اب اس کے ذکر سے کیا حاصل ؟ رمیش بابو، بسنت کی رت بیت چکی ہے۔ کوئل کی

کوک میں اب مٹھاس کہاں سے آئے گی؟" اور ایک طنز بھری مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر جھلک اُٹھی۔

"پریما اتنی بے رحم نہ بنو۔ پتاجی کی باتوں میں آگیا تھا....... اور میں نے تمہیں بھولنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن تمہیں بھول نہ سکا..... میں جانتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں کہ پتاجی نے جو کچھ کہا تھا وہ سب جھوٹ تھا۔ خواہ اُن کا مطلب کچھ بھی ہو۔ لیکن وہ سب جھوٹ تھا...... آج سے کئی برس پہلے، میرے سینے میں جو آگ لگی تھی، وہ آج بھی اُسی طرح دہک رہی ہے۔ کوئی طاقت اُسے بجھا نہیں سکتی..... تمہاری محبت کی قدر نہ کرنا میرا سب سے بڑا گناہ ہے، مگر اب تو مجھے کافی سزا مل چکی ہے' اب میرے حال پر رحم کرو رانی!" آنسوؤں کی بوندیں اُس کی آنکھوں سے ڈھلک کر رخساروں پر بہنے لگیں۔

پریما کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔

"بولو، پریما...... بن سکو گی میری؟"

شرم سے پریما کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ آہستہ سے سر ہلا کر اقرار کر ہی لیا اُس نے! آخر دل ہی تو ہے، وہ مجبور ہوگئی۔

اور رمیش نے وفورِ مسرت سے اسے بے اختیار اپنی طرف کھینچ لیا۔

# مصوّر

"..... فن کار کے فن جمیل کا جادو کبھی تمہاری آنکھوں پر بھی پڑا ہے؟
سچ بتانا، کیا کبھی تمہارے دل نے بھی یہ سوچا ہے کہ وہ سینے کو چیر کر فن کار کے
فن جمیل کی دلفریبیوں میں خود کو کھو دے؟" جمنا کی لہروں کی طرح لہراتی ہوئی ناگن
زلفوں کو کاندھا دیتی ہوئی نرگس نے اپنی نوکرانی سے پوچھا۔

نوکرانی چپ رہی۔

نرگس نے پوچھا "کیوں؟....."

نوکرانی بات کاٹتی ہوئی بولی "ساڑھی یہی یا دوسری .......
کون سی لاؤں؟ چائے بھی تو بنانی ہے نہ؟"

"نہیں چائے تو تسنیم کے گھر..... ہاں ساڑھی، کل جو کراچی سے
آئی ہے نہ، وہی لے آؤ۔" نرگس نے لونڈر کے فوارے سے اپنے بالوں کو مہکاتے
ہوئے کہا۔

نوکرانی مسکرا اٹھی۔

"کیوں، اب کیا سوجھی جو مسکرا پڑی؟ کیا بنارسی ساڑھی ہمارے لئے نئی بات ہے؟"

"نہیں بیٹی۔ بڑی دُلہن کہتی تھیں۔ بنارسی ساڑھی پہن کر نرگس دلہن سی لگنے لگے گی۔ یہ لو پہن کر ذرا شیشے میں دیکھو، تم خود ہی اپنے آپ پر فریفتہ ہو جاؤ گی۔"

نوکرانی کے منہ پر اپنی نازک نازک انگلیاں رکھتے ہوئے بولی "بس، بس، جو بات پوچھتی ہوں اُس کا تو جواب دیتی نہیں۔ بڑی آئی بڑی دُلہن کی سگی بن کر مجھے چھیڑنے ـــــ" کہتی ہوئی کچھ شرماتی، لجاتی نرگس دو قدم آگے بڑھ گئی۔

نوکرانی نے کہا "نہیں بیٹی۔ تم جو پوچھو بتاؤں گی۔"

"سچ لالہ؟ میری اچھی لالہ۔ تم کبھی تو ابھی بائیسویں بہار دیکھ رہی ہو۔ کیا تمہاری آنکھوں میں بھی کبھی کسی فن کار کی آنکھیں محبت کی مسکراتی ہوئی چاندنی لے کر ہنسی تھیں؟"

سنتے ہی نوکرانی کا دل نہ جانے کیوں بے کل ہو گیا۔ نرگس نے دیکھا نوکرانی اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

نرگس نے اُس کی سفید چادر پر لہراتی ہوئی کالی ناگن سی چوٹی کو چھو کر پوچھا "برا مان گئیں لالہ؟"

"نہیں۔"

"برا ہی تو مان گئیں، اس نادان بیٹی کو معاف کر دو لالہ کہیں ماں سے نہ کہہ دینا۔"

"نہیں نہیں۔" کہتی ہوئی نوکرانی قدم آگے بڑھانا ہی چاہتی تھی کہ نرگس نے

اُس سے لپٹتے ہوئے پوچھا" سچ سچ بتاؤ لالہ کیا بات ہے جو برا مان گئیں، تم تو جانتی ہی ہو میں تمہیں ..... "

"نہیں! تم نے تو دل کے تار چھیڑ دیئے ہیں نرگس؟ دل چاہتا ہے تم کہتی جاؤ اور میں سنتی رہوں آنسو بہتے جاتیں دل کا بار ہلکا ہو" نوکرانی نے کہا۔

"تب ایسی باتیں اور کہوں لالہ؟"

"نہیں نہیں اب نہیں، میں سُن نہیں سکتی۔ سینے میں آگ دہکی ہوئی ہے۔ اُسے نہ کریدو۔ میں جل جاؤں گی اور کسی کی یاد بھی جل کر راکھ ہو جائے گی۔"

"میرے دل میں ایک طوفان مچا ہوا ہے۔ آگ بھڑک اُٹھی تو جیسے کی ترستی ہوئی آرزوئیں کامیاب نہ ہو سکیں گی۔ بندھ ٹوٹ جائے گا اور میں بہاؤ کی تیزی میں بہہ جاؤں گی۔ رہا سہا آسرا بھی جاتا رہے گا، اس کی آرزو میں ...."

"ہیں یہ کیا کہا تو نے لالہ؟ اُن کی آرزوئیں ..... نہ جانے اور کیا کہتی کہ ماں نے پکارا" نرگس شمع کے یہاں نہ جاؤ گی کیا؟ دو گھنٹے ہو گئے، ڈرائیور کار لیے کھڑا ہے۔"

"آئی امی جان" کہتی ہوئی نرگس چلی گئی۔ لیکن دل میں ایک ننھا طوفان لے کر سوچتی ہوئی کہ لالہ کے دل میں بھی کوئی بسا ہے' تو کیا عورت اسی لئے ہے کہ جلتی جائے' آہ نہ کرے؟ تکلیف سہے۔ اُف نہ کرے۔ اچانک موٹر اپنی گلی سے نکل کر ایک کشادہ سڑک پر چلنے لگی۔

شمع نے نرگس کا دس بجے تک انتظار کیا۔ مگر نرگس کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ آج اُس کا دل ایک نئی اُلجھن محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ٹیلیفون کے پاس پہنچ کر رسیور اٹھایا اور ۲۲۷۴۴ کو رنگ کیا۔ دفتر میں چھٹی تھی۔ پھر بھی دلاور ایک

ضروری خط کی خاطر ڈاک دیکھنے دفتر چلے آئے تھے۔ ٹیلیفون کی گھنٹی کی آواز سن کر انھوں نے، ریسیور اٹھایا اور پوچھا "ہیلو! کون ؟"

جواب نہ دے کر شمع نے پوچھا "دلاور صاحب ہیں ؟"

دلاور، حیرت زدہ سے ہو کر سوچنے لگے۔ یہ کون عورت ہے جو اُسے پوچھ رہی ہے۔ مگر اتنی جلدی کچھ فیصلہ نہ کر سکے پھر بھی انھوں نے نہیں. کہنا ہی مناسب سمجھا۔

"کیا آج وہ نہیں آئیں گے ؟"

"جی نہیں ۔"

"کیوں ؟"

"وہ چھٹی پر ہیں، بیماری کی گود میں پل رہے ہیں انہیں اپنا خون دیکر بیماری کو رجھانا ہے نہ ؟"

"تو کیا وہ بیمار ہیں ؟"

"اجی وہ بیمار کب نہ تھا، وہ تو پیدائش کے وقت سے لے کر اب تک بیمار ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ وہ اب تک مرا کیوں نہیں۔"

"آپ کون ہیں ؟ ان کے متعلق ایسی منحوس باتیں آخر آپ کیوں کر رہے ہیں ؟ آپ کا انھوں نے کیا بگاڑا ہے ؟"

"اجی انہوں نے میرے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا۔ اگر میں ڈاکٹر ہوتا...."

"تو کیا کرتے، انہیں مار ڈالتے ۔"

"اجی اگر انھیں مار نہیں سکتا تو بہت میٹھی نیند تو ضرور سلا دیتا۔ مجھے تو دلاور صاحب کی زندگی ایک بوجھ ......"

شمع اپنے دلاور کے متعلق ایسی باتیں نہ سن سکی۔ اُس نے ادھ

"ای ڈی ایٹ" کہہ کر ٹیلیفون بند کر دیا۔ اتنی حسین گالی سن کر دلاور صاحب پھولے نہ سماتے۔ وہ ہنس رہے تھے۔ چپراسی نے پوچھا "کون ہے؟ کس کا ٹیلیفون ہے بابوجی؟"

"کسی کا نہیں۔ میرا ہی تھا۔ ہاں۔ آج کس کی ڈیوٹی ہے؟" دلاور نے پوچھا۔

"نمبر چار کمرے والوں کی" چپراسی نے کی۔

دلاور نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر چپراسی کو دیتے ہوئے کہا "لو کچھ کھا لینا۔ اگر کوئی پوچھے کہ ٹیلیفون پر کون بولتا تھا تو کہہ دینا کہ ڈیوٹی والا پشاوری بابو! سمجھے؟"

"جی"

"نہیں تو ڈیوٹی والے کی بدنامی ہوگی۔ کہ وہ حاضر نہیں رہتا۔

"بہت اچھا بابوجی!" کہتا ہوا چپراسی جھک کر سلام کرنے لگا۔ دلاور وہاں سے چلے تو آئے مگر رہ رہ کر یہی خیال انہیں پریشان کر رہا تھا کہ ٹیلیفون کس کا تھا؟ کیا کوئی مجھ سے محبت کرتی ہے؟ مگر میں تو اُسے جانتا ہی نہیں؟ معلوم ہوتا ہے دلاور کوئی اور ہوگا۔ ہاں..... ہوگا کوئی ــــ" یہ سوچ کر وہ اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔

---

نرگس عین اسی وقت شمع کے مکان پر پہنچی۔ جبکہ وہ ٹیلیفون پر گالیاں دے رہی تھی۔ ماں نے کہا "نرگس تمہارے انتظار میں شمع بیکل ہو رہی ہے اُس نے ابھی تک چائے بھی نہیں پی" کہتی ہوئی میں اپنے کمرے میں چلی گئی اور اکبری کو بلا کر کہا کہ نرگس آگئی ہے چائے دے آؤ"

"بہت اچھا" کہتی ہوئی اکبری باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

نرگس کو شمع کی "یو ایڈی ایٹ" کے لفظ بہت برے محسوس ہوئے اور اُس نے "اچھا" کہہ کر زمین پر پاؤں مارا اور الٹے قدموں اپنے گھر واپس چلی آئی۔

اکبری نے کمرے میں آکر کہا "چائے تیار ہے۔"

شمع نے کہا۔ "نرگس تو ابھی تک آئی نہیں، چائے کس کے ساتھ پیوں؟"

ماں نے اپنے کمرے سے کہا: "اری وہ تو کب کی یہاں پہنچ چکی ہے تجھے پریشان کر رہی ہے۔ یہیں کہیں کسی کمرے میں چھپ گئی ہوگی۔"

شمع، ماں کے کہنے سے اُسے تلاش کرنے لگی۔ مگر نرگس ہوتی تو ملتی۔ آخر مایوس ہو کر دھڑام سے بستر پر گر پڑی۔ اکبری نے کہا۔ "نرگس آپا آئی تو ضرور تھی۔ ہم سب نے دیکھا ہے لال موٹر۔"

"اری ہاں، لال موٹر تو اسی کا ہے، پھر وہ گئی کہاں؟ ذرا تو ہی ادھر اُدھر دیکھ، میں ٹیلیفون سے اُسے معلوم کرتی ہوں۔"

شمع نے جلدی ۵۵۵۴ کو رنگ کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجنے لگی اور بہت دیر تک بجتی رہی۔ شاید کوئی سننے والا موجود نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد گھنٹی بند ہوگئی اور گھر گھر کی آواز آنے لگی۔ ایکسچینج نے کہا: "ٹیلیفون کو مذاق کا آلہ نہ بنائیے۔ رسیور اتار لیا گیا ہے۔ وہ لوگ آپ کی بات سننا نہیں چاہتے۔"

ماں نے شمع کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"دیکھو نہ ماں شہزادی صاحبہ ٹیلیفون بھی نہیں سنتیں۔"

"تو پھر چھوڑ دے اسے، اپنا مغز کیوں کھپا رہی ہے؟ نرگس گھر پر نہ ہوگی۔" ماں نے سمجھایا۔

"مگر مجھے اس کے ساتھ "نغمہ فردوس" میں جانا ہے نہ ماں۔"

"اکیلی چلی جاؤ نہ۔"

"نہیں ماں۔"

دلاور نے جو تصویر گذشتہ رات ختم کی تھی اُسے وہ بہت دیر سے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے ـــــ دیکھ رہے تھے اور دل ہی دل میں سوچ رہے تھے۔ بس اسے دیکھتا ہی دیکھتا سو جاؤں۔ اور تمام رات اسی کے حسین خواب دیکھتا رہوں۔ اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے کو مل جائیں۔ اچانک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون؟"

"میں ہوں شمع۔"

"شمع۔"

"جی ہاں۔"

"کون شمع" سوچتا ہوا اٹھا۔ دروازہ کھولا۔ ایک جوان سال۔ خوبصورت دوشیزہ، اپسرا کی طرح دل لبھانے والی! دلاور کے ساتھ ہی ہاتھ میں ایک بنڈل اٹھائے اندر ایسے داخل ہوئی جیسے اُس کا اپنا گھر ہو۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر بولی "تم اب تک سوئے نہیں مصور؟"

"جی نہیں۔"

"کیوں؟"

"یونہی۔"

"کسی حسین تخیل میں الجھ گئے تھے کیا؟"

"جی ایسا تو نہیں، ہاں مگر . . . . ."

"مگر کیا؟ پوچھنے کی اجازت ہے؟"

"کیوں نہیں ؟"

"آپ حیران تو ضرور ہوں گے کہ جان پہچان نہ ہونے کے باوجود میں بڑی بے تکلفی سے باتیں کر رہی ہوں۔ لیکن . . . ."

"جی نہیں، حیرانی کی کونسی بات ہے۔ یہ آپ کا اپنا ہی گھر تو ہے۔"

"شکریہ۔ اگر تکلیف نہ ہو تو ذرا سا پانی پلا دیجئے۔"

دلاور نے چپ چاپ گلاس اٹھایا اور صراحی سے پانی انڈیل کر گلاس شمع کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

"شکریہ!" پانی پینے کے بعد شمع نے کہا۔

"شکریہ کی اس میں کونسی بات ہے۔"

"پانی بہت میٹھا ہے۔"

"یہ تو محض آپ کا خیال ہے۔ کہئے آپ کی کیا خدمت کی جائے۔"

نرگس کے گھر آپ کو بلایا، آپ نہ آئے۔ ٹیلیفون پر آپ سے وقت مقرر کرنا چاہا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ بے چاری نرگس آپ کے لئے تڑپ تڑپ کر۔"

"میرے لئے ؟ نرگس ؟ کون نرگس ؟"

شمع بولی "چھوڑیئے ان باتوں کو۔ جب سے اباجان نے آپ کی مصوری کی تعریف کی ہے۔ تب سے ہی آپ سے ملنے کا موقع تلاش کیا جا رہا ہے میں، اپنی بہت سی تصویریں اپنے ساتھ لائی ہوں جو "پوز" پسند ہو۔ اسے آپ اپنے ہاتھوں سے "انلارج" کر دیں۔ پھر میں اور نرگس آپ سے مصوری سیکھ کر مصور بننا چاہتی ہوں۔"

دلاور یہ سن کر ہنس پڑے۔

"ہنستے کیوں ہو؟" شمع نے پوچھا۔

"یہ سن کر کہ میں بھی اب مصور سمجھا جانے لگا ہوں۔"

اچانک شمع کی نگاہیں دلاور کے آگے رکھے ہوئے بورڈ پر پڑیں۔ دلاور شمع کے آنے سے پہلے جس تصویر کے متعلق سوچ رہے تھے وہ ابھی انھوں نے بورڈ سے علیحدہ نہ کی تھی۔ شمع نے غائرانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کس کی تصویر ہے؟ بہت خوبصورت ہیں یہ' اور آپ نے تو ان کی خوبصورتی میں اور بھی چار چاند لگا دیئے ہیں، کون ہیں یہ؟

"یہ؟" دلاور نے تصویر کی طرف دیکھ کر ایک ہلکا سا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "چور ہیں نگران کی چوری چھپ نہ سکی۔"

بہت ہی میٹھی ہنسی ہنستے ہوئے دلاور نے تصویر اٹھا کر اپنی آنکھوں کے سامنے رکھ لی۔

"دیکھئے میں نے یہ خط ابا جان کو لکھا ہے۔" شمع نے ایک خط دلاور کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"پڑھ کر سنایئے کیا لکھا ہے آپ نے؟"

"نہیں آپ ہی پڑھئے۔"

شمع کے اصرار پر دلاور نے خط لے لیا اور پڑھنے لگے۔ لکھا تھا۔

"میں چاہتی ہوں کہ میرا شوہر فن مصوری کا ماہر ہو اور اپنا ثانی نہ رکھتا ہو۔ اسی شہر میں...... اس سلسلہ میں امی جان مفصل طور پر لکھ رہی ہیں۔ ہاں آپ نے جو ایک مل اور ایک کوٹھی جہیز میں دینے کا وعدہ کر رکھا ہے' وہ اب پورا کرنا ہوگا۔ اس وقت تک تو وہ ایک معمولی سے مکان میں رہتے ہیں...."

دلاور خط پڑھ کر بے اختیار ہنس پڑے۔

"کیوں ہنس پڑے؟"

"مصوری محلوں میں نہیں جھونپڑیوں میں ہی پلتی ہے خاتون۔"

"اس لئے کہ محلوں میں آہیں اور آنسو نہیں ملتے۔ محلوں میں پازیب کی جھنکار ہوتی ہے۔ جھونپڑیوں میں بھوک کی آگ اور ہاہاکار۔ محلوں میں عطر و لونڈر کی خوشبو اور رخساروں پر پوڈر کی سفیدی اور بناوٹ کی سرخی ہوتی ہے۔ اور جھونپڑیوں میں نہ عطر و لونڈر کی خوشبو اور نہ بناوٹی سرخی! ان پھٹے پرانے اور موٹے جھوٹے کپڑوں میں لپٹے ہوئے جسموں میں مصوری کا کمال اور تخیل کی بلندیاں بدرجہ اتم موجود رہتی ہیں۔ کنول کا پھول تالاب کی کیچڑ میں اُگتا ہے۔ سمندر کی گہرائی اور ریگستان کے کھلے میدان میں نہیں سمجھیں خاتون!"

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس تصویر کی خوبصورتی پر ریجھ گئے ہیں۔ اسی لئے ہماری طرف نہیں دیکھتے۔" شمع نے بن کر کہا۔

"آپ بالکل ٹھیک سمجھی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے آپ بہت سمجھدار ہیں، کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے گریجویٹ تو ضرور ہوں گی۔" دلاور نے پوچھا۔

"جی ..... دو سال ہوتے ایم' اے پاس کیا ہے۔" شمع نے نگاہیں جھکا کر جواب دیا۔

"اوہ بہت خوب! پھر تو آپ کا ہونے والا دولھا بہت ہی خوش قسمت ہے۔" دلاور ایک ہلکی سی انگڑائی لے کر بولے۔

"تو آپ کو یہ تصویر بہت پسند ... ہے؟" شمع نے پوچھا۔

"جی مجھے نہیں تو میرے دل اور میرے آرٹ کو تو یقیناً پسند ہے۔"

"تب ہی تو اتنی رات تک انکی پرستش ہو رہی ہے۔"

"کیا خوب۔ آپ تو میرے دل کی کہہ رہی ہیں مصور اسی کی تصویر شوق سے بناتا ہے۔ جس پر وہ جان و دل سے فریفتہ ہو جاتے اور جو مصور پر فریفتہ ہو اکی

تصویر مصور نہیں بناتا۔ ذرا غور کرنے کی بات ہے۔"

"دولت اور دولت مندوں کو شاید آپ پسند نہیں کرتے ؟"

"نہیں یہ بات نہیں، میں آرٹ کا پرستار ہوں، آرٹ کا دولت سے کوئی تعلق نہیں۔ دولت انسان کو غرور اور اپنے سے کم حیثیت انسانوں سے نفرت کرنا سکھاتی ہے۔ اور آرٹ انسان کو انسانیت بھرا دل دیتا ہے اور دُنیاوی مسرتوں سے مالامال کر دیتا ہے اور اسی میں زندگی کی خوشی مضمر ہے۔ اصل معنوں میں جو مصور ہے وہ آرٹ کا پرستار ہے وہ اپنے آرٹ کو کبھی بھی اپنے ذاتی فائدہ کے لئے استعمال نہیں کرتا۔ اُس کا تخیل جو چاہتا ہے اُسے کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اُس دن نہ جانے کیوں میری آنکھوں نے "انہیں" اس نرالے انداز میں دیکھا، دیکھا تو پہلے بھی تھا لیکن یقین مانیئے اُس دن میری آنکھوں میں پھول ہلنے لگے۔ بسنت ناچ اٹھا۔ دل کی خواہش اور آرزو نے مجھے مجبور کر دیا اور میں نے یہ تصویر بنا دی۔ آرٹ ہمیشہ گناہ سے دور، نیکی کے پاس، اور زندگی کی گہرائیوں میں ہی رہتا ہے۔"

"تب تو ایک تصویر میری بھی بنا دو، منہ مانگے دام دوں گی۔" شمع نے کہا۔

"نہیں خاتون یہ فوٹوگرافر کا کام ہے۔"

"لیکن آخر اس تصویر میں کیا ہے جو مجھ میں نہیں ہے ؟"

"یہ تو سینے کی گہرائیوں میں چھپا ہوا ہے میرا دل ہی بتا سکتا ہے۔ خاتون اپنے دل سے ہی نہ سمجھ لو، اپنی خواہشات کے سہارے جینے والا دل مصور کے دل کو کیا سمجھ سکتا ہے۔"

"تب تو آپ ہمیں مصوری بھی نہ سکھا سکیں گے ؟"

"مسرتوں کے جھرمٹ میں زندگی کی خواہشات کے سہارے آگے بڑھ سی

چلو۔ آرٹ حاصل کرنا اور مصور کو پالینا آسان نہیں ہے۔ آرٹ مصور کے دل میں رہتا ہے اور آرٹ حاصل کرنے کے لئے مصور کا دل بن جاؤ۔ آرٹ ایک نہ ایک دن خود ہی تمہارے دل میں مسکرا اُٹھے گا۔"

نرگس جو دروازے کے باہر کھڑی تھی۔ سہم گئی۔ ..............

شمع نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور سامان اٹھایا۔ مصور نے ایک میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ آداب کہا اور دروازہ بند کر لیا۔

# شوخیاں

زندگی کے آئینے میں ہر روز نت نئی صورتوں کے عکس جھلکتے ہیں۔ اُن میں سے کچھ تو چھپ جاتے ہیں اور کچھ مٹ جاتے ہیں۔ کچھ دھندلے پڑ جاتے ہیں اور اور کچھ نظروں میں کھب جاتے ہیں اور بار بار اپنی جھلک دکھا کر دل پر ایک جادو سا ڈال جاتے ہیں۔ روحی کے حسین سراپا کا جو عکس میرے دل کے آئینے میں اترا وہ کچھ ایسا ہی تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں، میں اُس کے بہت قریب ہو گیا۔ دن رات میری آنکھوں کے سامنے اُس کا حسین سراپا رقص کرنے لگا۔ پہلے میں کسی کے حسن سے مسحور نہ ہوتا تھا اور نہ کسی کے متعلق کچھ سوچا کرتا تھا لیکن اچانک زندگی نے کروٹ بدلی اور میری زندگی طلسم محبت میں الجھ کر لذت سی محسوس کرنے لگی۔

دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح، برج اور سینما کے شوق کا بھوت مجھ پر کچھ اس طرح سوار تھا کہ میں گھر اور گھر والوں کی ذرا بھی پروا نہ کرتا تھا۔ زندگی کی ہر ساعت کو آزادی کے ساتھ گذار دینا مجھے بہت پسند تھا۔ گھر کی تمام ذمہ داریاں

بھابیجان نے اپنے ہی سر لے رکھی تھیں اور میں بالکل آزاد تھا۔

صبح کا سہانا وقت تھا۔ میں اپنے آدھے جسم کو چادر میں لپیٹے ہوئے اخبار پڑھ رہا تھا۔ نوکر میز پر چائے رکھ کر چلا گیا۔ میں نے اُٹھ کر سگریٹ سلگایا اور ابھی چائے کا ایک گھونٹ لے کر سگریٹ کا دوسرا کش کھینچا ہی تھا کہ ایک جانی پہچانی پیر کی ہلکی سی چاپ سنائی دی۔ میری نگاہیں دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ دروازے کی چوکھٹ پر بھابی مسکرا رہی تھیں۔ کمرے کے اندر داخل ہوتے ہوئے بولیں۔

"دیکھا روحی، میرا کہنا سچ ہوا نا؟ ابھی تک نواب صاحب نے بستر ہی نہیں چھوڑا۔"

روحی کا نام سنتے ہی میں چونک اٹھا۔ نام تو پہلے بھی سنا تھا لیکن آمنا سامنا کبھی نہ ہوا تھا۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو دروازہ کی اوٹ میں کھڑی ہوئی روحی کی بڑی بڑی شوخ اور چنچل آنکھوں پر میری نظریں جم گئیں اور وہ شرما کر پیچھے ہٹ گئی۔

"ارے تم شرما رہی ہو، گھر کے لوگوں سے بھی شرم؟ آؤ، یہاں آؤ نا!"

بھابی نے شرم سے دوہری ہوتی ہوئی روحی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر کھینچ لیا۔

میں تکیے کو گود میں دبائے اُٹھ بیٹھا۔ بھابی نے اُسے سامنے والے صوفے پر بٹھا دیا اور خود بھی اُس کے پاس بیٹھ گئیں۔

"بھابی، آپ کی تعریف؟" میں نے کنکھیوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بھابی سے پوچھا۔

اُس کی نازک صراحی دار گردن شرم سے جھک گئی۔ اُس کے کندھوں پر لمبی لمبی دو چوٹیاں ناگن کی طرح بل کھانے لگیں اور اُس کا چاند سا چہرہ میری نگاہوں سے قدرے اوجھل ہو گیا، مگر اس کی اُمنڈتی ہوئی جوانی اور چھلکتے ہوئے شباب نے میرے خوابیدہ جذبات کو جگا کر میرے دل میں ایک طوفان سا برپا کر دیا۔

"اوہ، کتنے عجیب ہو تم؟" بھابی نے مجھے پُر معنی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے

اپنی عادت کے مطابق ہنس کر طنز یہ لہجہ میں کہا "نہیں نہیں جانتے تم ؟ یہ ہیں ڈاکٹر صاحب کی نورِ نظر آنسہ روحی! یہیں پڑھتی ہیں، انٹرنس میں. کتنی بار یہاں آ چکی ہیں. مگر تمہیں برج، سینما اور آوارہ مزاج دوستوں سے فرصت ملے جب تو کسی اور طرف متوجہ ہو دیکھا روحی، یہ تمہیں جانتے بھی نہیں!"

بھابی، روحی کی تعریف اور میری بے پروائی کی داستان بھی! ایک ہی سانس میں بیان کر گئیں۔ ایک محلّے میں رہتے ہوئے اپنے پڑوسیوں سے ناواقف رہنا واقعی میری غلطی تھی۔ بلا جھجک سر ہلا کر میں نے اپنی غلطی کا اعتراف کر کے بات کا رُخ بدلتے ہوئے کہا "بھابی، معاف کرنا چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے" اور میز پر سے پیالی اٹھا کر منہ سے لگالی۔

"عجیب بدتمیز ہو تم ؟ کسی اور سے بھی تو پوچھا ہوتا۔ ٹھہرو، میں اپنی چائے بھی یہیں منگوا لیتی ہوں، ساتھ ہی پئیں گے، کیوں روحی ؟"

"میں چائے پی کر آئی ہوں بھابی" ستار کی جھنکار کی طرح دبی ہوئی دلکش آواز سنائی دی۔

یوں تو لڑکیوں کی آواز میں مٹھاس ہوتی ہی ہے، مگر خوبصورت لڑکیوں کی آواز شاید اور بھی زیادہ شیریں اور دلکش ہوتی ہے۔ گلابی رخساروں کو چھوتے ہوئے کانوں کے حسین آویزوں پر نظر پڑتے ہی جگنوؤں کا خیال آگیا۔ جوان آرزوئیں پر لگا کر روحی کے اردگرد پرواز کرنے لگیں۔

"تو کیا ہوا ؟ ایک پیالی اور! ٹھہرو میں ابھی آئی" اپنے ساتھ اٹھتے ہوئے روحی کے کاندھے کو دبا کر بٹھاتے ہوئے بھابی نے کہا۔

لڑکیاں میرے نزدیک ایک الجھی ہوئی پہیلی سے کم نہیں اور ان کی شرم و حیا کا فلسفہ سمجھنے سے میں ہمیشہ قاصر رہا ہوں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ قدرت نے

انہیں دلکشی و رعنائی عطا کی ہے لیکن پھر بھی بناؤ سنگھار کر کے کسی نہ کسی کی نگاہوں کا مرکز بننا کیوں پسند کرتی ہیں؟ ـــــ اور پھر پسند کرتی ہیں تو کسی کے نظر بھر کر دیکھنے پر شرم سے دوہری ہو جانے کے کیا معنی؟ آخر ایسا کیوں کرتی ہیں؟ مگر اس کے باوجود میں ان کے شرما جانے کی عادت کو پسند کرتا ہوں۔

"آپ اتنی شرما کیوں رہی ہیں؟" بھابی کے چلے جانے پر میں نے سوال کیا۔

وہ خاموش رہی۔

"آرام سے بیٹھئے نا! آپ کسی پرائی جگہ تھوڑا ہی ہیں۔" میں نے ہنس کر کہا اور بھابی کو کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر جلدی سے بولا۔ "دیکھو نہ بھابی! کیسی دوہری ہوئی بیٹھی ہیں۔"

بھابی ہنس پڑیں۔

کپڑوں کی ہلکی سی سرسراہٹ کے ساتھ شرم سے گالوں کی سرخی کو کانوں تک پھیلاتا ہوا اس کا چاند سا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کے چہرے کے نقوش حد درجہ دلفریب اور جاذب نظر تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کی تمام رعنائیاں اسی ایک چہرے میں سمٹ آئی ہیں۔ پنجابی لباس میں وہ سراپا شعر و شباب معلوم ہو رہی تھی۔

نوکر چائے کی ٹرے میز پر سجا کر چلا گیا تو چائے بنانے کی ڈیوٹی بھابی نے میرے سپرد کر دی۔ شاید رہی کو نہ پہچاننے کی میرے لئے یہ سزا منتخب کی گئی تھی۔

"آپ چائے میں شکر تو زیادہ پسند کرتی ہیں نہ؟" میں نے اس کے چہرے پر اپنی نگاہوں کو مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں" گھبراہٹ کے باعث بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔

بھابی کی نظر بچا کر میں نے اس کی پیالی میں اتنی زیادہ شکر ڈال دی کہ پہلے ہی گھونٹ میں اُسے چائے نو کیا' اچھا خاصا شربت کا مزہ آگیا ہوگا۔ اُس نے مسکراہٹ کو پتلے پتلے سرخ ہونٹوں سے دباتے ہوئے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا اور چپ چاپ پی گئی۔

شرم اور جھجک کا پردہ زیادہ دیر تک حائل نہ رہا اور تھوڑی ہی دیر میں بہت حد تک بے تکلفی ہوگئی۔ اُس کا مسکرانے اور شرمیلی نگاہوں سے بار بار دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ باتیں کرنے کا انداز بہت ہی دلفریب معلوم ہو رہا تھا۔

"ایک ایک پیالی اور بھابی! کافی چائے بچ گئی ہے!" اس مرتبہ بھی میں نے اُس کی پیالی میں شکر بہت زیادہ ڈال دی۔ لیکن اُس نے دیکھ لیا اور زیرِ لب مسکرا کر خاموش ہو رہی۔

میں نے آہستہ سے اٹھا کر پیالی اُس کی طرف بڑھا دی۔ پیالی پکڑتے وقت اُس کی انگلیاں نہ جانے کیوں کانپ رہی تھیں۔ پیالی اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر میری گود میں آپڑی۔ میں گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ میرا شب خوابی کا لباس خراب ہوگیا تھا۔

"معاف کیجئے گا!" اُس نے محجوب ہوتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں!" میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی شوخ آنکھوں اور زیرِ لب مسکراہٹ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اُس کے جاتے جاتے مجھ پر جان بوجھ کر گرائی ہے اور چائے میں زیادہ شکر ڈالنے کا مجھ سے بدلہ لیا ہے۔ اس کی یہ ادا مجھے اور بھی زیادہ پیاری معلوم ہوئی۔

روحی کی دور ہوتی ہوئی جھجک نے میری زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اُس کی بچوں کی سی شوخی' شرارت اور ہنسی مذاق میں وقت گزارنا میرا

دل پسند مشغلہ بن گیا۔ ٹینس کھیلنے کا وقت ہوتا تو ریکٹ کہیں غائب کر دیا جاتا۔ دوست ملنے آتے تو چپکے سے کہلوا دیا جاتا کہ گھر پر موجود نہیں، کہیں جانے کے لئے سائیکل نکالتا تو دونوں پہیوں میں پنکچر! بھابی یہ سب باتیں دیکھ کر ہنستیں اور میرا خوب خوب مذاق اڑاتیں۔

اس کے والد بھی عجیب و غریب قسم کے جھکّی آدمی تھے۔ روحی کی چودھویں سالگرہ کے موقع پر دوسرے دوستوں، ملاقاتیوں اور پڑوسیوں کے ساتھ ہمیں بھی مدعو کیا گیا۔ کوٹھی کے آگے باغیچہ میں کھانا کھلانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔

جب میزیں کھانے کے سامان سے آراستہ ہو گئیں اور سب لوگ کھانے کے لئے بیٹھے تو مجھے چھری کانٹا اٹھاتے ہوئے دیکھ کر روحی یکایک چونک اٹھی۔

"ارے، آپ بھی کھائیں گے؟"

میں اس کی آنکھوں میں حیرت اور گھبراہٹ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سب لوگوں کی نگاہیں اس پر جم گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی اہم راز کا اظہار کرنا چاہتی ہے۔

"معاف کیجئے گا کوئی خاص بات نہیں ہے۔" حاضرین سے مخاطب ہو کر اس نے کہا اور پھر ڈاکٹر صاحب سے بولی پاپا! بات یہ ہے کہ آج صبح ہی سے انکے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔"

"واقعی؟" ڈاکٹر صاحب نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"مگر...... مجھے تو" میں کہنا ہی چاہتا تھا کہ روحی بول اٹھی "آپ چپ رہئے، میں ہی کہے دیتی ہوں۔" پھر ڈاکٹر صاحب سے مخاطب ہو کر بولی۔ "بات یہ ہے پاپا کہ آپ طبیعت خراب ہونے کے باعث پارٹی میں شامل نہیں ہونا چاہتے تھے مگر میں یہ سوچ کر یہاں کھینچ لائی کہ کھانا کھائیں یا نہ کھائیں،

کم از کم ساتھ تو رہے گا۔"

"مگر مجھے تو۔" میں نے پھر کہنا چاہا کہ مجھے کچھ تو نہیں ہوا، یہ تو محض آپ کی دختر نیک اختر کا مذاق ہے مگر کہہ نہ سکا۔ روحی نے کہنے کا موقع ہی نہ دیا۔ جلدی سے بولی۔ "مگر مجھے تو یہ کھینچ لائی ہیں، میں تو آنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ یہی کہنا چاہتے ہو نہ تم، لیکن میں تو اس خیال سے آپ کو یہاں لائی تھی کہ دہاں اکیلے پڑے پڑے آپ کی طبیعت گھبرائے گی اور ویسے بھی آپ بڑے بے پروا ہیں، پاپا، کھانے پینے میں ذرا بھی پرہیز نہیں کرتے۔ بھابی سے پوچھ لیجیے نا!"

بھابی کو نہ جانے کب کا بدلہ لینا تھا۔ آنکھوں کو نچاتے ہوئے بولیں روحی ٹھیک کہتی ہے، دیکھئے نہ، مجھ سے انھوں نے کچھ نہیں کہا، ورنہ دوا منگالی ہوتی۔" پھر وہ بڑے اطمینان سے کیک کے ٹکڑے پر چھری چلانے لگیں۔

"پیٹ میں اگر کچھ خرابی ہو تو بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ کہاں ہو رہا ہے درد، ذرا دکھانا۔" ڈاکٹر صاحب نے کھڑے ہو کر میرے قریب آکر کہا۔

"میرے پیٹ میں درد ورد نہیں۔" میں نے جھلا کر کہا۔

"بڑے بے پرواہ ہیں پاپا۔" روحی نے میری طرف شرارت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اچھا کولڈ ڈرنک، تو پی سکتے ہیں نہ؟"

"کولڈ ڈرنک"؟ "نہیں بیٹی نہیں! دیکھو! ان کے لئے ایک گلاس لسّی بنوا دو، مصری ڈال کر، چینی نہیں۔"

عجیب مشکل میں پھنس گیا میں، روحی مجھے بولنے ہی نہیں دیتی تھی اور اس کے جھکّی والد اپنا ہی راگ الاپ رہے تھے۔ خدا سے لے کر شیطان تک کی قسمیں کھانے پر بھی انہیں مجھ پر اعتبار نہ آیا۔ میری بدنصیبی دیکھئے جب سب مہمان لذیذ و پرتکلف کھانوں کی پلیٹیں صاف کر رہے تھے تو میرے سامنے

سے پلیٹیں اٹھائی جا رہی تھیں اور جب سب "کولڈ ڈرنک" پی رہے تھے میں لسّی کا ایک ایک گھونٹ کر کے پیتا ہوا روحی کو دل ہی دل میں کوس رہا تھا۔

ندامت، پریشانی اور غصہ کی حالت میں جب میں گھر لوٹا تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہی پلیٹیں جو میرے آگے رکھی گئی تھیں، سب کی سب میرے کمرے میں میز پر سجی ہوئی تھیں۔ روحی نے اتنی چالاکی اور ہشیاری سے انہیں نوکر کے ہاتھ میرے یہاں بھجوایا تھا کہ کسی کو ذرا بھی شبہ نہ ہوا۔

شب و روز کی بڑھتی ہوئی بے تکلفی کو دیکھ کر ڈاکٹر صاحب نے روحی کی بہت سی ذمہ داریوں کا بوجھ مجھ پر ڈال دیا، وہ اگر بازار یا سنیما دیکھنے جانا چاہتی اور مجھے اس کے ساتھ جانا پڑتا، تو راستہ میں مجھے اس کی جن جن شرارتوں کا سامنا کرنا پڑتا، بس میں ہی جانتا ہوں۔ وہ مجھے پریشان کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتی۔ بعض اوقات تو میں غصہ کے مارے خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتا اور کبھی مجھے بے اختیار ہنسی آجاتی۔ جب سنیما ہال میں پردہ پر کوئی دلچسپ منظر آتا تو عین اسی وقت اُسے شدت کی پیاس لگتی اور جب میں فلم دیکھنے میں حد درجہ منہمک ہوتا تو اُسے گھر جانے کی سوجھتی اور فلم دیکھنے کے لئے مجھے اُس کی خوشامد کرنا پڑتی اور وہ دیر تک مجھ سے خوشامد کراتی۔ تب جا کر کہیں مانتی۔

جوں جوں دن گذرتے گئے میں اس شریر لڑکی کی جانب کھنچتا چلا گیا۔ اُس کی نت نئی شرارتیں اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے میری آنکھوں سے اوجھل نہ ہوتیں۔ ہر لمحہ ہر وقت اُسی کا خیال میرے ذہن و دماغ پر چھایا رہتا۔ جوان آرزوؤں کو شاید پر لگ گئے اور طاقت پرواز بڑھتی گئی اور ــــــ اور روز بروز بڑھتی ہی گئی۔

"ارے چپ چاپ کیسے لیٹے ہو؟ باہر نہیں آؤ گے کیا؟" بھابی نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

"یونہی لیٹا ہوا تھا! وہ ——" میں نے کہا "بھابی! آج روحی نہیں دکھائی دی"
بھابی زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ پھر بولیں "تو یوں کہو کہ اس کے خواب دیکھے جا رہے ہیں"

"تم بھی عجیب ہو بھابی! کسی کے متعلق پوچھنا بھی گناہ ہے؟" میں کھڑکی سے نیلے آسمان پر قوسِ قزح کو دیکھتے ہوتے بولا۔

"اب آئے بھی کیسے؟ شرما رہی ہوگی بے چاری! اُس کی منگنی ہو گئی ہے نہ"

"منگنی؟ . . . . !" بات میرے گلے میں اٹک گئی۔ اندھیرے کمرے میں چکر لگاتے، پھڑپھڑاتے چمگادڑ کی طرح منگنی کا لفظ میرے دل و دماغ میں ایک طوفان سا اٹھانے لگا۔

"ارے یہ کیا؟ تمہارا چہرہ کیوں اتر گیا؟"

"نہیں تو!" میں نے یکایک چونک کر کہا۔ پھر ہنسنے کی کوشش کی تو سامنے آئینے میں اپنی روتی ہوئی صورت دکھا دی۔

"مٹھائی کھلاؤ تو ایک بات بتاؤں؟"

"کیا؟"

"یہی کہ منگنی کس کے ساتھ ہوئی ہے"

"کسی سے بھی ہو، مجھے کیا کرنا ہے"

"یہ بننا کب سے سیکھا ہے؟ جانتے ہو کس سے! تم سے؟ تم بھی تو یہی چاہتے تھے! کیوں ٹھیک ہے نہ؟"

میں نے قدرے شرما کر آنکھیں نیچی کر لیں۔ اندر ہی اندر میرا دل خوشی کے مارے جھوم اٹھا۔

بھابی ہنستی ہوئی اندر چلی گئیں۔

دوسرے دن باغ میں، میں چپ چاپ ایک بنچ پر اکیلا بیٹھا تھا۔ نارنگی رنگ کا چمکتا ہوا چاند پتوں میں سے جھانک رہا تھا۔ لہراتی، گنگناتی، ٹھنڈی نشیلی ہوا بہہ رہی تھی۔ کیاریوں میں فوارہ مستی سے اُبل رہا تھا۔

"اوہ، آپ یہاں بیٹھے ہیں؟" روحی نے میری قریب والی جھاڑی سے نکل کر میرے قریب آتے ہوئے کہا۔

وہ میرے پاس ہی بیٹھ گئی۔ باتوں باتوں میں، میں نے کہا "ایک بات بتاؤں؟"

"کیا؟"

"اب ہم دونوں بہت جلد ایک ہو جائیں گے۔"

"کیا کہا؟ اب ہم دونوں بہت جلد ایک ہو جائیں گے۔ ہوں، یہ منہ اور مسور کی دال۔"

"تو کیا میں تمہارے قابل نہیں؟"

"آئینے میں کبھی صورت دیکھی ہے کبھی؟" ہاتھ بڑھا کر اُس نے ایک کچی توڑتے ہوئے کہا۔

"تو، میں تمہیں پسند نہیں!"

"کچھ اچھے نہیں لگتے ہو تم! تمہاری ناک تو بہت ہی لمبی ہے اور آنکھیں ——— آنکھیں بھی چھوٹی چھوٹی سی ہیں، اندر کو دھنسی ہوئی۔" پھول کو اس نے مسل کر میرے اوپر پھینک دیا اور مسکراتی ہوئی اندر بھاگ گئی اور بھابی کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

"بھابی! بھابی! یہ کہتی ہیں کہ میں انہیں اچھا نہیں لگتا!" میں نے پیچھے سے پہنچ کر کہا۔

"کیا؟"

"ردحی کہتی ہے، میں اچھا نہیں لگتا۔"

"پاگل کہیں کے! اتنا بھی نہیں سمجھتے۔" بھابی نے ردحی کے حیا آلود چہرے پر نظر ڈال کر کہا۔ "نہیں کے معنی ہوتے ہیں ہاں!"

بات ہونی تھی، ہو کر رہی۔ جلسوں اور پارٹیوں کے درمیان ہم دونوں کا بیاہ خوب دھوم دھام سے ہو گیا۔

وہ رات بھی آگئی، جب دل کی کلی کھل جاتی ہے۔ سینے کی دھڑکنیں محبت کا مستی بھرا راگ سنانے کے لئے بیقرار ہو جاتی ہیں زندگی کو ایک نیا پیغام ملتا ہے اور دو روحیں ایک دوسرے میں سما کر آخری سانس تک کے لئے ایک ہو جاتی ہیں۔

میں نے حجلۂ عروسی میں داخل ہو کر، ہنستے ہوئے، آہستہ سے دروازہ بند کر دیا۔ پھولوں سے سجے ہوئے پلنگ پر وہ سر سے پیر تک چادر اوڑھے لیٹی ہوئی دکھائی دی۔ کمرے میں روشنی کم کر دی گئی تھی، سمجھ نہ سکا کہ آخر اس کا مقصد کیا ہے۔ بہر کیف میں اُس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آنکھ لگ گئی ہے۔

"آج کی رات سونے کی نہیں جاگنے کی ہے محترمہ!" اُسے چونکا دینے کے خیال سے، میں نے چادر کھینچ کر ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

لڑھکتا ہوا بے پیندہ کا لوٹا پلنگ سے آ کر میرے پیروں پر اتنی زور سے گرا کہ میں پیر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ حیرت سے دیکھا پلنگ پر دو تکیے پڑے تھے اور شاید سر کی جگہ لوٹا تھا۔ جسے چادر میں دیکھ کر مجھے اُس کے سونے کا شبہ ہوا تھا۔ دیوار کے اس کونے میں دبی دبی ہنسی سنائی دی، جیسے دو نقرئی کٹوریاں باہم ٹکرا رہی

ہوں۔ وہ وہاں اندھیرے میں کرسی پر سر جھکائے بیٹھی ہنس رہی تھی۔

"یہ شرارت ؟" دونوں تکئے اس پر پھینکتے ہوتے میں اُسے پکڑنے کے لئے دوڑا۔

"بن گئے نہ !" اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

صحن میں بھابی کی ہنسی گونج رہی تھی۔